ماہنامہ

جون 2026ء

طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا بیاسی واں سال

قرآنی نظامِ
ربوبیت کا
پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِی (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

یومِ شہادت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

(صفحہ نمبر: 7 پر ملاحظہ کریں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

-1 عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

-2 قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

-1 وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

-2 وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

-3 وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
جون 2026ء

جلد 79 | شمارہ نمبر 06

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 100 روپے فی پرچہ
پاکستان: 1200 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1500 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: پاکستان ایران اور فلسطین	محمد سلیم اختر	4
خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بُود	شاہکارِ رسالت سے اقتباس	7
درسِ قرآن (سورۃ یونس آیات 46 تا 58)	پرویز علیہ الرحمۃ	23
نوجوان اور نظامِ تعلیم کی از سرِ نو تشکیل	خورشید انور، سوات	44
فکرِ پرویز اور حج کا عالمی اجتماع	اقبال ادریس، منگورہ سوات	48
شخصیات اور نظریات	آصف جلیل، لاہور	51
نماز کی اہمیت	مرتب: محمد سلیم اختر	54
اچھی زندگی کیا ہے؟ قرآن کا جواب	انجینئر سلیم اقبال، منگورہ سوات	58
بچوں کا صفحہ: تم بہت بہادر ہو	ادارہ	62

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

محمد سلیم اختر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان، ایران اور فلسطین

پاکستان جیسے جیو-اسٹریٹجک اہمیت کے حامل ملک کے لیے ایک جامع اور پائیدار خارجہ پالیسی کی تشکیل محض وقتی جذبات، گروہی وابستگیوں یا قلیل مدتی سیاسی مصلحتوں پر نہیں کی جا سکتی، بلکہ بین الاقوامی تعلقات (International Relations) کے جدید تناظر میں اس کی بنیاد مستقل اصولی موقف، عدل، حکمتِ عملی اور حق پر ہونی چاہیے۔ قرآنِ حکیم کا آفاقی فکر انسان اور ریاست دونوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ ہر حال میں انصاف اور حقانیت کے اصولوں پر کاربند رہیں۔ سورۃ النساء کی آیت 135 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ یہ گواہی خود تمہارے اپنے خلاف ہو، یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف)۔

یہ قرآنی اصول آئی آر کے ''اخلاقی حقیقت پسندی'' (Ethical Realism) کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے، جہاں ریاستیں اپنے مفادات کا تحفظ تو کرتی ہیں مگر اخلاقی اور اصولی حدود کے اندر رہ کر۔ اس تناظر میں ایک اسلامی اصولوں پر مبنی ریاست کا فرض محض نعروں، بیانات اور جذباتی ردِعمل تک محدود رہنا نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی برادری میں ظلم کے خلاف ایک مؤثر، تعمیری اور اصولی بیانیہ (Narrative) تیار کرنا ہے، جو مظلوم انسانوں کے ساتھ باوقار اور حکیمانہ انداز میں کھڑا ہو۔

قرآنی فکر میں ظلم اور جارحیت کسی بھی سطح پر قابلِ قبول نہیں ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اصولی اسلامی ریاست کسی جابر یا غاصب قوت کی نہ تو اخلاقی پشت پناہی کر سکتی ہے اور نہ ہی مادی مصلحتوں کی خاطر حق و انصاف کے آفاقی قوانین سے دستبردار ہو سکتی ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت 8 اس حوالے سے واضح ترین اسٹریٹجک رہنمائی فراہم کرتی ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہی تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب ہے)۔ چنانچہ فلسطین، کشمیر یا دنیا کے کسی بھی جغرافیائی خطے میں اگر

انسان ظلم کا شکار ہیں تو ان کے حق میں آواز بلند کرنا پاکستان کے لیے محض ایک روایتی سفارتی ذمہ داری نہیں بلکہ ایک گہرا قرآنی اور دینی تقاضا ہے۔ تاہم، قرآنی اسلوب یہ بھی سکھاتا ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں حمایت اور نصرت کا عمل جذباتی اشتعال کے بجائے تدبر، طویل مدتی منصوبہ بندی اور ملکی استطاعت (National Capability) کے مطابق ہونا چاہیے۔ غیر حکیمانہ جوش وقتی طور پر داخلی عوام کو تو مطمئن کر سکتا ہے، مگر بین الاقوامی نظام (International System) میں کوئی دیرپا تعمیری نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، سورۃ النحل کی آیت 125 میں دی گئی ہدایت: اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ (اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے) سفارتی دائرہ کار میں دانشمندی اور تدبر کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔

اس فکری فریم ورک کے تحت پاکستان کے لیے موزوں ترین اسٹریٹجک راستہ یہ ہے کہ وہ ایک اصولی، واضح اور خودمختار سفارت کاری (Independent Diplomacy) اختیار کرے۔ عالمی فورمز جیسے کہ اقوامِ متحدہ یا او آئی سی میں ظلم کی بیخ کنی، بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کا دفاع، قانونی و سیاسی حمایت، اور انسانی بنیادوں پر طبی و تعلیمی تعاون جیسے کثیر الجہتی (Multilateral) میدانوں میں فعال کردار ادا کیا جائے۔ یہ وہ توازن ہے جس کے ذریعے ایک ریاست عالمی برادری میں اپنا اخلاقی وقار اور سافٹ پاور (Soft Power) بھی قائم رکھتی ہے اور اپنے قومی مفادات اور سلامتی کو بھی غیر ضروری خطرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ مزید برآں، قرآن وفائے عہد اور بین الاقوامی اعتماد سازی (Confidence Building Measures) کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیتا ہے، جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت 34 میں ارشاد ہے: وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَہۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا (اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی)۔ بین الاقوامی تعلقات میں اگر کوئی ریاست اپنے کثیر الجہتی یا دوطرفہ معاہدات اور سفارتی ذمہ داریوں سے انحراف کرتی ہے تو اس کی اخلاقی ساکھ اور اسٹریٹجک معتبریت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا، پاکستان کو ایک ایسی اسمارٹ خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے جو نہ تو ظلم کے سامنے مصلحت پسندانہ خاموشی اختیار کرے اور نہ ہی زمینی حقائق سے کٹی ہوئی غیر عملی جذباتیت کا شکار ہو، بلکہ ایک 'امتِ وسط' کے طور پر اعتدال اور توازن کو اپنا شعار بنائے۔

ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے پیچیدہ معاملات میں بھی پاکستان کی پالیسی کا اصل معیار فرقہ وارانہ وابستگی یا قومیت پرستی کے بجائے حق اور بین الاقوامی انصاف ہونا چاہیے۔ جہاں فلسطینی عوام پر ریاستی دہشت گردی اور ظلم ہو، وہاں ان کی غیر مشروط حمایت انسانی اور قرآنی دونوں اعتبارات سے ناگزیر ہے، اور اسی طرح اگر ایران یا کوئی دوسرا علاقائی ملک کسی اصولی یا جائز بین الاقوامی موقف پر کھڑا ہو، تو اس کے ساتھ انصاف کے تقاضوں کے مطابق تعاون کیا جانا چاہیے۔ لیکن اگر کسی مقام پر علاقائی طاقت کی سیاست (Power Politics)، پراکسی وارز یا مسلکی مفادات حقائق کو دھندلا دیں، تو قرآنی اصول ہمیں

یاد دلاتے ہیں کہ ایمان کا تقاضا اندھی صف بندیوں کا حصہ بننا نہیں بلکہ صرف اور صرف حق کے ساتھ وابستگی ہے۔ خارجہ پالیسی کے ان اصولوں کو ملکی داخلی سیاست، تکفیری زبان یا داخلی تقسیم کے لیے ایندھن بنانا اصل اسٹریٹجک مقصد کو فوت کر دیتا ہے۔ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے کوئی بھی ریاست صرف نعروں اور بیانات کے ذریعے بین الاقوامی سیاست کا رخ نہیں بدل سکتی جب تک کہ اس کے پاس ٹھوس داخلی قوت (Internal Might) موجود نہ ہو۔

بین الاقوامی تعلقات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ خارجہ پالیسی دراصل اندرونی طاقت کا ہی بیرونی عکس ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس سچائی کو سورۃ الانفال کی آیت 60 میں اس طرح بیان فرمایا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (اور جہاں تک ہو سکے ان کے مقابلے کے لیے قوت کی تیاری رکھو)۔ جدید دور میں یہ قوت محض روایتی عسکری طاقت تک محدود نہیں، بلکہ یہ ایک مضبوط اور خود کفیل معیشت، مستحکم سیاسی نظام، اعلیٰ تعلیمی ڈھانچے، سائنسی و تکنیکی مہارت، اور تحقیق پر مبنی تھنک ٹینکس (Think Tanks) کا مجموعہ ہے۔ بیرونی قرضوں اور معاشی امداد پر انحصار کرنے والی ریاست کبھی بھی مکمل طور پر آزادانہ خارجہ پالیسی وضع نہیں کر سکتی۔ لہٰذا، پاکستان کو ایک طرف اگر مظلوم اقوام کے لیے عالمی سطح پر فعال سفارت کاری کرنی ہے، تو دوسری طرف اپنی داخلی اصلاح، علمی ترقی اور معاشی خود مختاری پر پوری توجہ مرکوز کرنی ہوگی تاکہ ملک صرف ایک ”ردِعمل دینے والی ریاست“ (Reactive State) نہ رہے بلکہ فکری، اخلاقی اور تزویراتی رہنمائی فراہم کرنے کے قابل ہو سکے۔ قرآنی بصیرت کی روشنی میں ایک ذمہ دار اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی محض مجرد ہمدردی کا نام نہیں، بلکہ ایک منظم، علم پر مبنی، معیشت سے پائیدار، اور قرآنی اقدار سے ہم آہنگ اسٹریٹجی کا نام ہے، جس پر چل کر پاکستان نہ صرف اپنے قومی مفادات کا فولادی تحفظ کر سکتا ہے بلکہ عالمی نظام میں عدل اور اصولی سیاست کی ایک مؤثر آواز بن سکتا ہے۔

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 1200 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ”طلوعِ اسلام“ کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمایئے۔ شکریہ

1985,1986,1987,1988,1991,1999,2000,2001,2002,2003,
2004,2005,2006,2011,2015,2016,2017,2018,2019
,2020,2021,2022,2023

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بسلسلہ یومِ شہادت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بُود

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

فاروقِ اعظمؓ نے 13ھ میں خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اب ہم 23ھ میں پہنچ گئے ہیں۔ اس دس سال کی قلیل ترین مدت میں (جو قوموں کی زندگی میں، کلمح البصر ہوتی ہے) جو انقلابات رُونما ہوئے، ان کی تفصیل کے لئے ایک جداگانہ (مستقل) تصنیف کی ضرورت ہے۔ مختصر الفاظ میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ آپ مختلف اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ جن حالات میں یہ جدید مملکت وجود میں آئی تھی اور جس قوم کے ہاتھوں یہ متشکل ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر کیا آپ کو دنیا کی کسی اور قوم کے ہاں اتنی قلیل مدت میں ایسے وسیع اور عظیم انقلاب کی مثال ملتی ہے؟

خارجی دنیا میں اِنقلاب

فتوحات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو دس سال کی قلیل مدت میں، پورے کا پورا ایران، شام، عراق، مصر، مملکتِ اِسلامیہ کا جزو بن چکے ہیں۔ یہ اُس زمانے میں ہوا جب سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات و اسبابِ آمد و رفت کی حالت یہ تھی کہ گھوڑے اور اونٹ سے زیادہ تیز رفتار سواری کوئی نہ تھی اور سانڈنی سوار کے سوا، نامہ و پیام اور احکام و ہدایات رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان حالات میں، فاروقِ اعظمؓ مدینہ میں بیٹھے، ہزاروں میل دُور جنگ کے میدانوں کے نقشے مرتب کرتے، کمانڈروں اور سپہ سالاروں کو ہدایات بھیجتے اور علاقہ فتح ہو جانے پر وہاں کا نظم و نسق سرانجام دیتے تھے۔ نئے مفتوحہ علاقوں کا سنبھالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ اس قدر دُور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے ممالک میں سے کسی ایک میں، بغاوت تو ایک طرف، خفیف سی سازش بھی نمودار نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے

کہ جو قومیں اسلامی مملکت کے زیرِ نگین آئیں وہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد عناصر کا مجموعہ تھیں۔ ہر قوم، دوسری قوموں سے مذہب، زبان، نسل، تہذیب وتمدن اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی تصورات میں الگ تھی اور یہ سب مل کر، خود عربوں سے الگ۔ یہ تمام باہمد گر متضاد عناصر ایک مملکت کی وحدت میں اس طرح سمو گئے کہ نہ ان میں کوئی تفاوت رہا نہ فتور، نہ اختلال رہا نہ اختلاف —— تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ ملکوں کا فتح کر لینا آسان ہے لیکن اس قسم کے متضاد عناصر میں اس طرح کی ہم آہنگی پیدا کر دینا کارے دارد۔ دیگر ممالک سے قطع نظر، خود سرزمینِ عرب کے اندر کچھ کم متضاد عناصر نہیں تھے اور انہوں نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مرکز کے تابع نظم ونسق کی زندگی بسر کرنی شروع کی تھی۔ ان میں بھی کہیں بغاوت نہیں اُبھری، سرکشی نمودار نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس طرح کے ڈسپلن اور فرماں پذیری کا ثبوت دیا جیسے وہ ہزاروں سال سے اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں فاروقِ اعظمؓ خاصے سخت گیر تھے۔ ان کی سرزنش بڑی شدید اور گرفت بڑی آہنی ہوتی تھی۔ اس باب میں وہ جری سے جری کمانڈر اور بڑے سے بڑے حاکم اور والی تک کو نہیں بخشتے تھے لیکن اس کے باوجود، کیا مجال جو ان میں سے کسی نے ان کے کسی حکم کے خلاف آنکھ تک بھی اٹھائی ہو۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ اُس مملکت کی کوئی مستقل فوج (STANDING ARMY) نہ تھی جو حکومت کے زیرِ کمان ہو۔ تمام فوج، افرادِ مملکت پر مشتمل تھی، جو عند الضّرورت رضا کارانہ جمع ہو جاتے اور انہی سے فوج ترتیب پا لیتی تھی۔ آپ سوچئے کہ جس حکومت کے پاس اپنی الگ مستقل فوج نہ ہو اور جو ہتھیار فوج کے پاس ہوں وہی عام افرادِ مملکت کے پاس موجود ہوں، اس میں کہیں ہلکی سی بغاوت کا بھی نمودار نہ ہونا، تاریخ کا فقید المثال کارنامہ نہیں؟ مفتوحہ علاقوں میں اس قدر امن وسلامتی اور خود اپنی قوم میں اس قدر صلح وآشتی، کس بات کا ثبوت ہے! صرف اس بات کا کہ نظامِ مملکت اس قدر عدل واحسان کے درخشندہ قرآنی اصولوں پر مبنی تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ نہ صرف مطمئن بلکہ شاداں وفرحاں تھا اور سربراہِ مملکت کا اپنا کردار اس قدر پاکیزہ اور بلند تھا کہ اس میں کسی کو کسی مقام پر انگشت نمائی کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ تاریخِ عالم اس قسم کے نظام اور نظام کے سربراہ کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ''انسائیکلوپیڈیا اوف اِسلام'' کا مقالہ نگار اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> یہ حقیقت یقیناً باعثِ صد تعجب ہے کہ مکہ کے ایک سادہ سے شہری نے کس طرح ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے۔ اس نے، تنہا اس نظامِ حکومت کے ذریعے جس کے خلاف کسی نے کوئی آواز بلند نہ کی، ان بدّؤں کو قواعد وضوابط کا پابند بنایا جو اس سے پہلے، قواعد وضوابط کے نام تک سے آشنا نہ تھے اور ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ حیرت ہے کہ اس نے بدّؤں کے سرداروں کو، جن کے ہاتھ میں ان قبائل کا پورے کا پورا اقتدار تھا، کس طرح کنٹرول میں رکھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قدر وسیع وعریض فتوحات تنہا عمرؓ کا کارنامہ نہیں تھا۔ لیکن یہ تنہا اسی کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ اس نے اتنے اتنے

بڑے جرنیلوں کو کبھی عنان گسیختہ نہ ہونے دیا اور بنو اُمیہ جیسے شہ زور اور صاحب اقتدار قبیلہ تک کی صلاحیتوں سے تو فائدہ اٹھایا لیکن انہیں صاحبِ اقتدار نہیں ہونے دیا۔ اس نے خالد بن ولیدؓ جیسے سپہ سالار کو جس طرح معزول کیا' اس سے ہم ان (حضرت عمرؓ) کے سیاسی تدبّر اور اقتدار کی محکمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر' ہم بلاتامل' انہیں سیاسی نابغہ (POLITICAL GENIUS) کے معزز لقب سے سرفراز کرتے ہیں۔ (نہ صرف ان کی فتوحات کی بنا پر بلکہ اس لئے بھی کہ) انہوں نے' اس قسم کے متضاد عناصر پر جن سے یہ جدید مملکت عبارت تھی' کس طرح وحدت اور استحکام کا نقش ثبت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی کہ عمرؓ کا زمانہ خلافت' بظاہر شخصی حکومت کا دَور نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جنونِ ملوکیت کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ (صفحہ 983' 1934ء ایڈیشن)

داخلی دُنیا میں اِنقلاب

پھر یہ انقلاب صرف خارجی دنیا میں ہی نمودار نہیں ہوا تھا۔ اُس قوم کی داخلی دنیا میں بھی جو نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی' وہ بھی عدیم النظیر اور فقید المثال تھی۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ عرب جن کی تگ و تاز کا بنیادی مقصد لوٹ مار تھا اور جو محض مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے ہر وقت آمادۂ جنگ و پیکار رہتے تھے' ان میں ایسا نفسیاتی تغیر واقعہ ہو گیا کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ایران کی فتح میں اِس قدر مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا جو اُن کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا لیکن اس میں سے کسی سپاہی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہ رکھی اور سارے کا سارا لا کر میرِ سپاہ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ دوسری طرف' ہم نے ایک بدولڑکی کو' رات کی تنہائیوں میں' اپنے خیمہ کے اندر' خود اپنی ماں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں' لیکن اس کے باوجود مَیں دودھ میں پانی نہیں ڈالنا چاہتی کیونکہ خلیفہ نے کہا تھا کہ جب کوئی اور دیکھنے والا نہ ہو تو اللہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے) دنیا کے بڑے بڑے فاتحین ملکوں کو فتح کر سکتے ہیں' بڑے بڑے مدبرین بساطِ سیاست پر انقلاب برپا کر سکتے ہیں لیکن قلوب کی دنیا میں ایسا انقلاب برپا کرنا دست پروردگانِ رسالتؐ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔

ہیکل کا خراجِ تحسین

اسی انقلاب کے پیشِ نظر ہیکل نے جن الفاظ میں' بارگاہِ فاروقیؓ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے' وہ بڑے جامع ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے کہا ہے کہ:

دس برس اور کچھ مہینے حضرت عمرؓ نے امیر المومنین کی حیثیت سے گزارے۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے لئے وقف تھے۔ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کا دل' ان کی عقل اور ان کے اعضاء و جوارح' اُس بارِ عظیم

کے اٹھانے میں مصروف رہتے تھے جو قضا وقدر نے ان کے شانوں پر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کے سپہ سالارِ اعظم تھے' فقہائے اسلام میں انہیں فقیہہِ اکبر کا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ ایک ایسے مجتہد تھے جن کی رائے سند سمجھی جاتی اور جن کا اجتہاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ ایک ایسے انصاف پسند اور پاک دامن قاضی تھے جو مقدمات کے فیصلے کرتے اور طاقت وروں سے کمزوروں کو اُن کا حق دلواتے تھے' وہ تمام مسلمانوں کے — بڑے سے پہلے چھوٹے' طاقت ور سے پہلے کمزور اور مالدار سے پہلے فقیر کے — شفیق ومہربان باپ تھے۔ وہ بندۂ مومن تھے جن کے اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچے ایمان نے ان کی خوداعتمادی میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کی رائے کی قدر وقیمت اُن پر اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار سیاست دان تھے جو اپنے ارادوں کو جانتے تھے اور اُنہیں اپنی مقدرت کے دائرے سے نکلنے نہ دیتے تھے اور ان کی مقدرت کے ساتھ ساتھ اُن کے ارادے بھی وسیع ہوتے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ نظر حکمران تھے جن کی عقل وحکمت نے اُن کے لئے مختلف النسل' مختلف اللسان اور مختلف المذاہب قوموں پر حکومت کرنا آسان بنا دیا تھا اور وہ رعایا کے معاملات کی تدبیر اس طرح کرتے تھے کہ لوگ ان سے اُپرائیں نہیں بلکہ قریب تر ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کی ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے کوئی عجیب نہیں اگر اُن کے عہد میں مسلمانوں کو سچے ایمان نے ابھارا' اُن کے دلوں میں شہادت فی سبیل اللہ کی تڑپ پیدا کی اور انہوں نے ایران' عراق' شام' مصر اور دوسرے ممالک فتح کر لئے اور فاروقِ اعظمؓ کے ان امتیازات کے پیشِ نظر کوئی حیرت نہیں اگر عرب مغرب کی انتہائی حدوں سے لے کر مشرق کے انتہائی سِروں تک تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ حالانکہ اسلام سے پہلے وہ ایک خانہ بدوش قوم تھے جو صرف انفرادی اغراض کے لئے جیتی تھی اور اجنبی اقتدار کی محکوم تھی۔

کتنی مہتم بالشّان تھی وہ کوشش' جو حضرت عمرؓ نے' دس سال کی مدت میں' یہ بارِ عظیم اٹھانے کے لئے صَرف کی تھی۔

اور طٰہٰ حسین کا

اور مصر ہی کا ایک اور نامور مفکر (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) اس باب میں لکھتا ہے:

میں نہیں جانتا کہ تاریخِ انسانی کسی ایسے شخص کی مثال پیش کر سکے جو حضرت عمرؓ کا سا زندہ' حسّاس' محتاط اور معصیت سے خائف ضمیر رکھتا ہو۔ جو اپنے حق میں ان باتوں سے بھی ڈرتا ہو جن میں ڈرنے کی کوئی بات نہ ہو' ان امور سے بھی اِبا کرتا ہو جن سے اِبا نہیں کیا جاتا اور اپنی ذات پر ایسی سختیاں کرتا ہو جو صرف ایک اولوالعزم انسان ہی کر سکتا ہے۔

(الفتنۃ الکبریٰ)

اور اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں جس مقام پر حضرت

فاروقِ اعظمؓ اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدّن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔ (ایضاً)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب (الفتنۃ الکبریٰ) درحقیقت ان حوادث وفتن پر مشتمل ہے جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں نمودار اوران کی شہادت پر منتج ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اس میں محض تمہیداً وہ کچھ لکھا گیا ہے جس کے اقتباسات اوپر درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں، جب وہ ان اسباب وعلل پر تبصرہ کرتا ہے جو اس فتنۃ الکبریٰ (شہادتِ امیرالمومنین حضرت عثمانؓ) کا موجب بنے، تو اس کی نگاہ پھر حضرت عمرؓ کی طرف اٹھتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

> جب ان تمام امور کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جن حالات نے حضرت عثمانؓ کو آ گھیرا تھا وہ ان کے اوران کے رفقاء کی طاقت سے باہر تھے۔ کہا جائے گا کہ حضرت عمرؓ کو بھی تو ایسے ہی حالات سے سامنا کرنا پڑا تھا اورانہوں نے ان پر قابو پا لیا تھا لیکن ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان منفرد شخصیتوں میں سے تھے جنہیں عالمِ انسانیت شاذ و نادر ہی پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کی غیر معمولی شخصیتیں دراصل اپنے جانشینوں کو سخت مشکلات اور آزمائشوں میں مبتلا کر جاتی ہیں بلکہ اگر احتیاط مانع نہ ہو تو میں یہاں تک بھی کہوں گا کہ درحقیقت حضرت عمرؓ کی عبقریت[1] (غیر معمولی صلاحیت) ہی ان حالات کی ذمہ دار ہے جن میں حضرت عثمانؓ اوران کے ساتھی گِھر گئے —— وہ عبقریت جو حضرت عمرؓ کے بعد ان کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ ملی جن میں حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں۔ (ایضاً)

اور جس کی مثال کی تلاش میں آسمان آج تک مصروفِ گردش ہے۔

اگلا پروگرام

عہدِ فاروقیؓ میں مملکت تو بے شک اس قدر وسیع وعریض ہو گئی تھی اوراس میں نظم ونسق بھی قائم ہو گیا تھا، لیکن قرآنِ کریم کی بلند اقدار کے مطابق، داخلی دنیا کا انقلاب ہنوز حجاز اوراس میں بسنے والے عربوں تک محدود تھا۔ اس کے بعد، حضرت عمرؓ کے سامنے یہ پروگرام تھا کہ جن ممالک کو انہوں نے فتح اور جن اقوام کو انہوں نے مسخّر کیا تھا، ان میں بھی اسی قسم کا انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ، پہلے مرحلہ سے کہیں زیادہ دقّت طلب اور صبر آزما تھا لیکن حضرت عمرؓ اس کا عزم کر چکے تھے، اس لئے کہ یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، خلافت سے مقصود تسخیرِ ممالک نہیں، بلکہ انسانی دنیا میں صحیح آسمانی انقلاب برپا کرنا ہے۔ تسخیرِ ممالک اس مقصدِ عظیم کا ذریعہ ہے، مقصود بالذّات نہیں، اسی مقصد کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو میرا ارادہ ہے کہ اگلے سال مملکت کا دورہ کروں گا اور ہر ملک کے مقامی حالات کا جائزہ لے کر

1۔ عبقریت GENIUS-NESS

وہاں قرآنی نظام کے نفاذ کی عملی تدابیر اختیار کروں گا۔

اَلمیہ

لیکن ان کی آنکھوں نے وہ ''اگلا سال'' دیکھا ہی نہ، اور انسانیت کا مقدر بدلتے بدلتے رہ گیا۔ تاریخِ عالم کا یہ المیہ اس قدر حیرت انگیز، زہرہ گداز، جگرسوز اور دوررس نتائج کا حامل ہے کہ اس پر آسمان کی آنکھ جس قدر بھی خون کے آنسو بہائے کم ہے۔ اس حادثۂ کبریٰ کے بعد، چودہ سو سال کی تاریخ، انسانیت کی حرماں نصیبیوں اور سوختہ بختیوں کی الم انگیز داستان کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس پیغام بر انقلاب کو دس سال بھی اور مل جاتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ ابنِ آدم نے اس فردوسِ گم گشتہ کو مدت ہوئی پالیا ہوتا جس کی تلاش میں وہ اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے ـــــ ستاروں کی آنکھ محوِ حیرت ہے کہ بعض حوادث کس طرح تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں!

اور یہ حادثہ تھا کیا؟ بجلی کی چمک، کوندے کی لپک، جس کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا لیکن جس نے عالمِ انسانیت کی متاعِ حیات کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ـــــ وہ حادثہ جسے تاریخ نے چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور نہیں سمجھی کہ اس اجمال میں زمانے کی کتنی گردشیں مستور ہو کر رہ گئی ہیں۔

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شُد

حادثہ کی تفصیل اتنی ہی ہے کہ 26 ذی الحجۃ 23ھ، مؤذن نے فجر کی نماز کی اذان دی۔ صحابہؓ مسجدِ نبوی میں جمع ہو گئے۔ حضرت عمرؓ امامت کے لئے کاشانۂ خلافت سے باہر تشریف لائے۔ دیکھا کہ نمازیوں کی دو ایک صفیں سیدھی نہیں۔ انہیں اشارہ سے سیدھا کیا۔ جماعت کھڑی ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے ابھی تکبیر کہی تھی کہ ایک شخص اچانک ان کے سامنے آیا[1] اور نہایت تیز خنجر سے ان پر متعدد وار کئے۔ آپ کی آنتیں کٹ گئیں۔ حادثہ کی تفصیل ختم ہوگئی۔

قاتل کا خنجر سینۂ عمرؓ میں نہیں، قلبِ کائنات میں پیوست ہو گیا۔

قاتل وار کر کے بھاگا۔ نمازیوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اُس نے اُن پر بھی وار کئے۔ یہاں تک کہ بارہ آدمی زخمی ہو گئے۔ ان میں سے، ایک کے قول کے مطابق، چھ اور دوسرے کے مطابق نو جانبر نہ ہو سکے۔ جب آخر الامر اس پر قابو پالیا گیا تو اُس نے اُسی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ اس طرح جرم کی اوّلین شہادت ہمیشہ کے لئے مٹ گئی اور باقی صرف خنجر رہ گیا جس کی زبان نے جو کچھ بیان کیا وہ ذرا آگے چل کر سامنے آتا ہے۔

تاریخ نے اس المیہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ہمارے سامنے ''حیرت'' کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اگر اس زمانے میں اس قسم کا کوئی حادثہ رُونما ہوتا تو حکومت ان سارے نمازیوں کو بھی شاملِ تفتیش کر لیتی جو اُس مسجد میں موجود تھے، کہ ان کی

1۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ سامنے سے نہیں آیا تھا، نمازیوں کی صفِ اوّل میں کھڑا تھا اور وہیں سے اُس نے حملہ کیا تھا۔

آنکھوں کے سامنے ایک شخص سربراہِ مملکت پر (چھپ کر، دور کھڑا، بندوق سے نہیں بلکہ) پاس آ کر خنجر سے حملہ کرتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی مدافعت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ آخر امام اور نمازیوں کی پہلی صف میں فاصلہ ہی کتنا تھا؟ اگر قاتل سامنے سے آیا تھا تو مسجد میں نماز کی حالت میں، کسی شخص کا اس طرح سامنے سے آنا' بجائے خویش ایک غیر معمولی اور اندیشہ خیز واقعہ تھا جس سے انہیں چوکنا ہو جانا چاہئے تھا۔ اور اگر وہ صفِ اوّل میں سے نکل کر آگے بڑھا تھا تو باقی نمازی خاموش کھڑے کیا دیکھتے رہے؟ آج کی حکومت بے شک انہیں شاملِ تفتیش کر لیتی لیکن ہم تو ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ (یہ کم و بیش) تمام نمازی' انصار و مہاجرین کا گروہ تھے جن کے مومنِ حقّا ہونے کی شہادت قرآن نے دی ہے اور جو اپنے امیر کے جاں نثار پروانے تھے' ان کے متعلق یہ وسوسہ وہم و گمان میں بھی نہیں آنا چاہئے کہ وہ (معاذ اللہ) اس سازش میں شریک[1] تھے۔ تاریخ نے جو کچھ اس حادثہ کے متعلق بیان کیا ہے (جو بادیٔ النظر میں بڑا ہی سطحی سا دکھائی دیتا ہے) اگر وہ صحیح ہے تو ان حضرات کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ناقابلِ فہم حد تک غفلت برتی۔ بہر حال' یہ ان کی غفلت کا نتیجہ تھا یا عدمِ تدبّر یا فقدانِ احتیاط کا' زمانے کے لئے حیرت و استعجاب کی ایک دنیا اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

آخری لمحاتِ زندگی

خنجر کے وار سے حضرت عمرؓ کی آنتیں کٹ گئی تھیں' زخم سے برابر خون بہے جا رہا تھا۔ جب آپ کو ذرا ہوش آیا تو آپ نے پہلا سوال یہ کیا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے۔ جب جواب اثبات میں ملا تو آپ کو اطمینان ہوا۔ دوسرا سوال قاتل کے متعلق تھا جب معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر مسلم' غیر عرب ہے تو آپ نے اس پر بھی اظہارِ اطمینان کیا کہ وہ کسی مسلمان اور اپنی قوم کے فرد کے ہاتھوں شہید نہیں ہوئے۔

طبیب بلائے گئے اور انہوں نے بصد تأسف کہہ دیا کہ زخم جان لیوا ہے۔ امیر المومنین تھوڑے سے وقت کے مہمان ہیں۔

جانشینی کا مسئلہ

غور کیجئے کہ ایک شخص کی انتڑیاں کٹ چکی ہیں — اس سے درد کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے — خون متواتر بہے جا رہا ہے۔ اسے دم بدم نقاہت بڑھ رہی ہے۔ معالج مایوس ہو چکے ہیں۔ موت سامنے کھڑی ہے اور مہلت یونہی گھڑی دو گھڑی کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے میں' اس عظیم شخصیت کو کون سا خیال پریشان کر رہا ہے! یہ کہ میرے بعد' نظم و نسقِ مملکت کا کیا ہوگا! میرا جانشین کیسا ہوگا۔ اس انتہائی کرب و الم اور اضطراب و انحطام کے عالم میں' آپ نے جس سکوت و سکون

1۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے لوگوں سے پوچھا بھی تھا کہ کیا واقعہ ان کے مشورہ یا علم سے سرزد ہوا ہے۔ اس پر لوگ کانپ اٹھے اور کہا کہ معاذ اللہ' معاذ اللہ' اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا!

اور جس تدبر وتحمل سے اس اہم ترین مسئلہ کے متعلق ایک جامع اسکیم مرتب فرمائی‘ جب مؤرخین اس پر غور کرتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ کسی موزوں شخصیت کو نامزد فرما دیجئے‘ جس طرح حضرت صدیقِ اکبرؓ نے آپ کا نام تجویز کر دیا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا (آزاد کردہ) غلام‘ سالمؓ اور ابوعبیدہؓ بن جراح میں سے کوئی زندہ ہوتا تو میں اس کی سفارش کر دیتا۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ اپنے بیٹے‘ عبداللہؓ سے کیوں گریز فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تجھے غارت کرے تو مجھے کون سے راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے (دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا سلیقہ نہیں آیا‘ تم اسے سربراہِ مملکت بنانے کا مشورہ دے رہے ہو!)۔ ہمارے نزدیک‘ اصل بات وہی ہے جو متعدد روایات میں آئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ’’یہ بات پسندیدہ نہ ہوگی کہ میں اپنے گھر والوں کے لئے خلافت چاہوں۔ اگر یہ اچھی بات ہے تو خاندانِ خطاب اس سے بہرہ یاب ہو چکا ہے اب یہ سعادت دوسروں کے حصے میں آنی چاہئے اور اگر اس میں کوئی خرابی کی بات ہے تو خاندانِ خطاب میں سے ایک اسے بھگت چکا ہے‘ باقیوں کو محفوظ رہنے دیجئے‘‘۔

انتہائی سوچ اور بچار کے بعد آپ نے چھ حضرات پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت متعیّن کر دی۔ اور کہہ دیا کہ یہ لوگ باہمی مشاورت سے آپس میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں ـــــ یعنی حضرت عثمانؓ۔ (2) حضرت علیؓ۔ (3) حضرت زبیرؓ بن عوام۔ (4) حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ۔ (5) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ (6) حضرت سعد ابی وقاص (رضی اللہ عنہم)۔ ان کے علاوہ اپنے بیٹے‘ عبداللہ کو بھی نامزد کیا لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف مشورہ دے سکے گا‘ خلافت کے لئے نہ امیدوار بن سکے گا‘ نہ منتخب کیا جا سکے گا۔ گویا ابنِ عمرؓ کی حیثیت اس کمیٹی کے (CO-OPTED) ممبر کی سی تھی۔

قرض کی ادائیگی

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد‘ اپنی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے ذمے کچھ قرض تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو معلوم تھا کہ آپ نے یہ رقم قرض لے کر نادار مسلمانوں پر خرچ کی تھی۔ آپ نے مشورہ دیا کہ آپ بیت المال سے روپیہ لے کر یہ قرض ادا کر دیں‘ ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔ آپؓ نے فرمایا کہ ہاں! بعد میں آپ لوگ میری رعایت سے یہ طے کر دیں گے کہ بیت المال کا قرضہ معاف کر دیا جائے۔ اس سے تم تو مطمئن ہو جاؤ گے لیکن جس مصیبت میں‘ مَیں (اللہ کے حضور) ماخوذ ہو جاؤں گا اس سے مجھے کون چھڑائے گا! میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے باپ کے قرضہ کی ذمہ داری لے لی اور ان کے دفن ہونے سے پہلے اسے ادا کر دیا۔

قبر کی جگہ

حضرت عمرؓ کی دلی خواہش تھی کہ آپ اپنے محترم رفقاء حضور نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہم پہلو‘ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں دفن ہوں۔ آپ نے اپنے بیٹے‘ عبداللہؓ سے کہا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ عمرؓ آپ کی خدمت میں

سلام عرض کرتا ہے ـــــ دیکھنا' امیر المومنین عمر نہ کہنا' صرف عمرؓ کہنا ـــــ اور مستدعی ہے کہ آپ انہیں پہلوئے حضورؐ میں دفن ہونے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ وہ جگہ میں نے اپنے لئے مختص کر رکھی تھی لیکن میں عمرؓ کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں۔ حضرت عبداللہؓ نے آ کر حضرت عائشہؓ کا پیغام سنایا تو آپ بہت خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ جب میں وفات پا جاؤں تو ایسا کرنا کہ میرا جنازہ لے کر جانا اور حضرت عائشہؓ سے ایک بار پھر اجازت طلب کرنا' ہوسکتا ہے کہ اِس وقت انہوں نے میری خاطر ایسا کہہ دیا ہوٗ اگر وہ میری وفات کے بعد بھی اجازت عطا فرما دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا' ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔

نزع کے عالم میں بھی اس قدر احتیاط' کسی فاروق ہی سے ممکن ہوسکتی ہے! کتنا نازک تھا یہ مقام اور کس قدر باریک تھا یہ فرق!

وللّٰہِ درُ' من قال

مرا مرنا' خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔

تقدیر کا مفہوم

تقدیر کے متعلق حضرت عمرؓ کی نگۂ بلند اور فکرِ عمیق' عمواس کے طاعون کے واقعہ میں ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ طبقات ابنِ سعد میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے خنجر مارا گیا' تو وہ کہہ رہے تھے کہ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا [33:38] ''اللہ کا امر' مقررہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے''۔ مطلب واضح ہے کہ اللہ کا مقرر کردہ قانون یہ ہے کہ حادثوں سے موت اُس وقت واقع ہوتی ہے جب حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت برتی جائے۔ لہٰذا' یہ حادثہ اللہ کے اسی قانون کے مطابق رُونما ہوا ہے۔

یہ ہے تقدیر کا دوسرا مفہوم!

مواخذۂ آخرت کا خیال

یوں تو آپؓ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب آپ کو مواخذۂ آخرت کا خیال نہ ہو لیکن موت کے قریب' فطرۃً یہ احساس اور بھی شدید ہوگیا۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ اس خیال سے پریشان نہ ہوں۔ مجھے امید ہے کہ نارِ جہنم آپ کو مَس تک نہیں کرے گی۔ اس شخص نے آپ کی طرف دیکھا تو آپؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ آپ نے اس سے کہا کہ ''اس باب میں تیرا علم بہت قلیل ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس آنے والے محاسبہ کے فدیہ میں دنیا کے سارے خزانے صَرف کر دیتا''۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے آپ سے کہا کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور ہر ایک کے حصے برابر برابر تقسیم

کرتے تھے اس لئے آپ امیر المومنین، امین المومنین، سیّد المومنین ہیں''۔ یہ سن کر آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابنِ عباسؓ! کیا تم اللہ کے حضور میرے لئے یہ شہادت دو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں میں اس کی شہادت دوں گا۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

لیکن لوگ جس قدر ان کی تعریف کرتے تھے، ذمہ داریوں کے محاسبہ کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش! میں عمرؔ ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ

اگر عمرؓ نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔

اسی حالت میں آپ نے اپنے اعزہ سے کہا کہ مجھے عام مسلمانوں کی طرح سادہ پانی سے غسل دینا، اس میں مشک وعنبر نہ ملانا۔ مجھے معمولی کفن دینا کہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اُسے اچھے ملبوس میں بدل دے گا اور اگر میں ایسا نہ ہوا تو میرا اچھے سے اچھا لباس بھی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہئے۔

آخری وقت فرمایا کہ اُف! اگر اللہ نے میری لغزشوں سے درگزر نہ فرمایا تو میرا انجام کیا ہوگا! یہ الفاظ زبان پر تھے کہ اسلام کا یہ آفتابِ عالمتاب غروب ہو گیا، ہمیشہ کے لئے غروب!

ایک مزدور، حضرت صہیبؓ رومی نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور حجرۂ حضرت عائشہؓ میں، حضور نبی اکرمؐ اور صدیق اکبرؓ کی معیّت میں دفن کر دیئے گئے۔ طوبیٰ لھم وحسن ماب۔ بعض روایات میں ہے کہ بدھ کے دن اُن پر حملہ ہوا اور دوسری صبح، 27 ذی الحجہ کو آپ دفن کئے گئے۔ لیکن دوسری روایت میں ہے کہ وہ اتوار کے دن یکم محرم 24ھ کو دفن کئے گئے۔ بعض روایات میں آپ کی تاریخِ وفات 8 یا 10 محرم بھی بیان کی گئی ہے۔

آپ کی عمر کتنی تھی، اس کے متعلق متعیّن طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں عدد السنین (سالوں کی گنتی) کا اندازہ کچھ ایسا ہی تھا، اس لئے صدرِ اوّل کی ممتاز ترین ہستیوں کے سنِ ولادت اور عمر کے متعلق بھی متعین طور پر بہت کم معلوم ہو سکتا ہے۔ اور تو اور، خود حضور نبی اکرمؐ کی عمر شریف کے متعلق بھی پختہ طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ طبقاتِ ابنِ سعد اور طبری، ابتدائی دَور کی مستند کتب تاریخ سمجھی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں حضورؐ کی عمر ساٹھ برس، تریسٹھ برس، اور پینسٹھ برس لکھی ہے۔ فاروق اعظمؓ کی عمر کے متعلق بھی یہی کیفیت ہے۔ مختلف روایات کی رُو سے آپ کی عمر پچپن برس، ساٹھ برس، اکسٹھ برس، تریسٹھ برس، اور پینسٹھ برس کی قرار پائی ہے۔ آپ کی وفات کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ 23ھ میں ہوئی لیکن (جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے) آپ کے سنِ پیدائش کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر فاروقِ اعظمؓ کی عمر تریسٹھ برس کی تسلیم کر لی جائے تو آپ، نبی اکرمؐ سے 13-12 برس عمر میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

رفقاء کا خراجِ تحسین

آپ کی وفات کے بعد، آپ کے رفقاء (دیگر صحابہ کبارؓ) نے جن جذباتِ خلوص ومحبت کا اظہار فرمایا اور جو خراجِ تحسین و آفریں آپ کی بارگاہ میں پیش کیا، اس کی تفصیل خاصی گنجائش طلب ہے۔ ہم ان میں سے چند ایک کے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب، حضرت عمرؓ کے جنازے کے قریب آئے اور فرمایا:

> مجھے آپ جیسے اعمالِ حسنہ والے انسان سے زیادہ کوئی محبوب نہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں بھی آپ جیسے اعمال لے کر اللہ کے ہاں پہنچوں۔ (صحیح مسلم وابنِ ماجہ، بحوالہ طنطاوی، طبع بیروت، صفحہ 461)

کتنی بڑی بات ہے جو چند لفظوں میں کہہ دی گئی ہے! حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ نے بیان کیا ہے کہ جب آپ کا جنازہ قبر کے قریب لایا گیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا "ہم کہا کرتے تھے کہ آپ کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے"۔ پھر فرمایا "لوگو! جب صالح لوگوں کا ذکر کیا جائے تو عمرؓ کا ذکر کیا کرو"۔ آپ (حضرت علیؓ) حضرت عمرؓ کو یاد کر کے اکثر رویا کرتے تھے۔ جب آپ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

> میں عمرؓ کی وفات پر اس لئے روتا ہوں کہ ان کی وفات سے اسلام میں ایک ایسا رخنہ پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ (تاریخ الخلفاء وابنِ جوزی ــــ بحوالہ طنطاوی، صفحہ 461)

علامہ طنطاویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں باہمی اختلاف کے دوران، آپ (حضرت علیؓ) نے دیکھا کہ بعض لوگ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق کچھ نازیبا الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ برسرِ منبر تشریف لے گئے اور ایک طویل اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے تذکارِ جلیلہ کے بعد کہا:

> ان کے بعد عمرؓ خلیفہ ہوئے تو کچھ لوگ ان سے ناراض تھے اور کچھ راضی۔ لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو جو پہلے ناراض تھے وہ بھی ان سے راضی تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ اور آپ کے ساتھی (حضرت ابوبکرؓ) کے نقوشِ قدم پر معاملات کو سنوارا۔ وہ ان دونوں کا اس طرح اتباع کرتے تھے جیسے بچہ اپنی ماں کا۔ بخدا وہ (حضرت عمرؓ) رفیق ورحیم اور مظلوموں کے لئے باعثِ تقویت ورحمت ونصرت تھے۔ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرتے۔ اللہ تعالیٰ نے حق ان کی زبان پر اتارا اور صدق کو ان کی شان ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ ہم خیال کیا کرتے تھے کہ ان کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے۔ انہوں نے اسلام لا کر اسلام کو تقویت بخشی اور اپنی ہجرت کو دین کے لئے وجہِ استحکام بنایا۔ اللہ نے منافقین کے دلوں میں ان کا رعب طاری کر دیا تھا اور مومنوں کے دلوں میں ان کی محبت استوار کر دی تھی۔ رسول اللہؐ نے انہیں جبرئیل اور (حضرت) نوحؑ کے ساتھ تشبیہہ دی تھی۔ طاعتِ الٰہی میں نقصان اٹھانا انہیں اس نفع سے زیادہ

محبوب تھا جو معصیتِ خداوندی سے حاصل ہو۔تم ان جیسے کہاں سے لاؤ گے! (طنطاوی۔طبع بیروت۔صفحہ 462)

حضرت ابوعبیدہ ابنِ جراحؓ کہا کرتے تھے کہ ''جب حضرت عمرؓ انتقال کر جائیں گے تو اسلام کمزور ہو جائے گا۔میں نہیں چاہتا کہ میں عمرؓ کے بعد زندہ رہوں''۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے (حضرت) عمرؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ:

بخدا! وہ حلیفِ اسلام، پناہ گاہِ یتیماں، محلِّ ایمان، منتہائے احسان، کمزوروں کے فریاد رس، عوام الناس کے مددگار تھے۔ انہوں نے حق کو نہایت استقامت اور احتسابِ خویش کے ذریعے قائم کیا۔حتیٰ کہ دین غالب آ گیا، ملک فتح ہو گئے اور میدانوں اور کہساروں پر اللہ کا نام بلند ہونے لگا۔ (الریاض النضرۃ۔بحوالہ طنطاوی صفحہ 463)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

تم قرآن اس طرح پڑھا کرو جس طرح عمرؓ پڑھا گئے ہیں۔وہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھے کہ لوگ ان میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی نہ نکلتے۔ان کی شہادت کے بعد وہ قلعہ ٹوٹ گیا ہے۔اب لوگ اسلام سے نکل سکتے ہیں۔

(طنطاوی صفحہ 464)

نیز (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) فرمایا:

اگر عمرؓ کا علم ایک پلڑے میں اور عرب کے تمام قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو بھی عمرؓ کے علم کا پلڑا بھاری ہوگا۔آپ کتابِ الٰہی کے سب سے بڑے عالم اور دینِ خداوندی کے سب سے بڑے فقیہہ تھے۔آپ کا داخلِ اسلام ہونا، اسلام کے لئے باعثِ فتح و نصرت، آپ کی ہجرت موجبِ تقویت اور آپ کی حکومت رحمت تھی۔

(طنطاوی۔صفحہ 464)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

جس کسی نے عمرؓ کو دیکھا اس نے جان لیا کہ اللہ نے انہیں، اسلام کو (دیگر تمام سہاروں سے) مستغنی کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔وہ اپنے کمالات میں، منفرد تھے۔ (ابنِ جوزی۔بحوالہ طنطاوی صفحہ 466)

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے — اور اس پر اپنی طرف سے صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ

اگر آج اسلام، ایک زندہ و پائندہ مکمل نظامِ معاشرہ (دین) کی شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ عہدِ فاروقؓ کا اسلام ہے۔حضور نبی اکرمؐ نے اس کی بنیاد رکھی، صدیقِ اکبرؓ نے خارجی خطرات سے اس کی حفاظت کی اور فاروقِ اعظمؓ نے اسے پروان چڑھایا۔(رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)

سازش کا انکشاف

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور اس امر کا احساس قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہ شہادتِ حضرت عمرؓ کے حادثۂ فاجعہ کے سلسلہ میں جو کچھ جاننے کے لئے قارئین اس قدر مضطرب و بے قرار ہیں' اسے سامنے لائے بغیر آگے نہ بڑھا جائے —— لیکن وہ معاملہ بڑا اہم بھی ہے اور نہایت شکیب آزما بھی۔

حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام ابولُولُوء فیروز تھا۔ یہ نصرانی المذہب' ایران کا باشندہ تھا۔ نہاوند کی جنگ میں پکڑا گیا اور والیٔ کوفہ' حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تحویل میں آ گیا اور انہی کے ہاں رہنے لگا۔ حضرت عمرؓ کسی ایسے قیدی کو مدینے میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے جو بالغ ہو چکا ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے ایک دفعہ آپ کو لکھا کہ ابولُولُوء بڑا اچھا بکدست' ہنرمند (لوہار' بڑھئی اور نقاش) ہے اسے مدینہ آنے کی اجازت دے دیجئے' یہ وہاں کے لوگوں کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔ آپ نے اسے اجازت دے دی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایک دفعہ یہ شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت مغیرہؓ مجھ پر زیادتی کرتے ہیں' میں کام زیادہ پیسوں کا کرتا ہوں اور وہ مجھے بہت کم مزدوری دیتے ہیں۔ آپ نے تفصیل معلوم کرنے پر کہا کہ اُس کی شکایت بے جا ہے۔ حضرت مغیرہؓ اس پر زیادتی نہیں کر رہے۔ یہ سن کر وہ ہونے کو تو واپس ہو گیا لیکن حضرت عمرؓ کے خلاف انتقام کی آگ کو سینے میں چھپائے رکھا۔ ایک دفعہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس سے گزرا تو آپ نے اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تو کہتا ہے کہ میں ایسی چکی بنا سکتا ہوں جو ہوا سے چلے۔ اس نے آپ کی طرف تُرشروئی سے دیکھا اور کہا کہ ''میں آپ کے لئے ایسی چکی بنا دوں گا کہ تمام لوگ اس کے متعلق باتیں کیا کریں گے''۔ کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے' آپ نے ان سے کہا کہ یہ شخص آج مجھے دھمکی دے گیا ہے۔ چنانچہ وہ موقعہ کی تلاش میں رہا اور اُس صبح آپ پر حملہ کر دیا۔

صاف نظر آ رہا ہے کہ تاریخ کا یہ بیان بڑا سطحی سا ہے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اتنی سی بات فیروز کو ایسے سنگین اور جرأت آزما جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرنے کے لئے کافی جذبۂ محرکہ قرار نہیں پا سکتی۔ مدینہ جیسے دارالخلافہ میں' حضرت عمرؓ جیسے سربراہِ مملکت کے قتل کے لئے اس سے کہیں زیادہ قوی جذبۂ محرکہ کی ضرورت تھی۔ اس جذبۂ محرکہ کی غمازی اس خنجر نے کر دی جس سے فیروز نے (حملہ کے بعد) خودکشی کر لی تھی۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے وہ خنجر دیکھا تو کہا کہ میں نے اس خنجر کو کل' ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا تھا' میں نے ان سے پوچھا کہ تم اس چھری سے کیا کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اس سے گوشت کاٹیں گے کیونکہ ہم گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہ دو دھارا خنجر اس مقصد کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے کہا کہ میں (حضرت) عمرؓ کے قاتل' ابولُولُوء کے پاس سے گزرا۔ جفینہ اور ہرمزان اس کے ساتھ تھے اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ میں دفعتہً ان کے پاس پہنچا تو وہ بھاگے اور ایک خنجر ان کے ہاتھوں

سے گر پڑا جس کے دو پھل اور بیچ میں دستہ تھا۔ ذرا دیکھوں کہ وہ خنجر کیسا ہے جس سے (حضرت) عمرؓ کو شہید کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے خنجر کو دیکھا تو کہا کہ یہ وہی خنجر ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔

ہرمزآن وہی ایرانی گورنر تھا جو پا بجولاں حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تھا اور (پانی کا پیالہ زمین پر گرا کر) ایک پُرفریب چال سے قتل ہونے سے بچ گیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو کر مدینہ ہی میں قیام پذیر ہو گیا تھا —— اور جفینہؔ، حیرہ کا رہنے والا عیسائی تھا جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا دودھ شریک بھائی تھا۔ وہ اس رشتہ سے اُسے مدینہ لے آئے تھے جہاں وہ لوگوں کو پڑھایا لکھایا کرتا تھا —— زبانِ خنجر نے اس طرح ایک گہری سازش کا راز افشا کر دیا۔

سازشیوں کا قتل

حضرت عمرؓ کے بیٹے، حضرت عبید اللہؓ کو جب اس سازش کا یقین ہو گیا تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ باپ کے قتل کے قصاص کے لئے جوش میں اُٹھے، تلوار ہاتھ میں لی۔ پہلے ہرمزآن کو قتل کیا پھر جفینہ کو۔ اس کے بعد ابولُولُوء کی ایک صغرسن بیٹی سامنے آئی تو اُسے بھی قتل کر دیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا۔

ضمناً، حضرت عبیدؓ اللہ کا یہ اقدام، اسلام کے قانونِ عدل کی رُو سے درست نہیں تھا، چنانچہ بعد میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ حضرت علیؓ نے ان کے قتل کئے جانے کا مشورہ دیا لیکن خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ نے خود خون بہا ادا کر کے معاملہ کا تصفیہ کر دیا۔ اس مقام پر ایک تجسّس طلب ذہن پھر متعجب رہ جاتا ہے کہ اس معاملہ کو نجی اور انفرادی، وارداتِ قتل اور ذاتی انتقام تک محدود رکھا گیا —— اور حکومت نے اس سازش کی تحقیقات کے سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا۔ اگر ایسا کر لیا جاتا تو عالمِ اسلام (شاید) ان خطرات سے (کم ازکم بڑی حد تک) محفوظ ہو جاتا جو بعد میں وقوع پذیر ہوئے اور جس سے تاریخ کا نقشہ بدل گیا۔

لیکن ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ موجبِ حیرت اس حقیقت کا احساس ہے کہ بعض اوقات، بڑے سے بڑے دیدہ ور، نہایت دوراندیش، انتہائی محتاط، مدبر سے بھی کس طرح ایسی چوک ہو جاتی ہے جس کے نتائج وعواقب بڑے دوررس ہوتے ہیں۔

احتیاط کی کمی

حضرت عمرؓ نہایت محتاط اور دوراندیش واقعہ ہوئے تھے۔ (مثلاً) جنگِ بدؔر کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن آپ مدینے میں، چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے، معرکہ بدؔر کے احوال و کوائف بیان کر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص مسجدِ نبویؐ کے باہر اونٹ سے اُترا ہے اور حضورؐ کی بابت دریافت کر رہا ہے۔ آپ فوراً آگے بڑھے۔ دیکھا کہ وہ عمیؔر بن وہب ہے —— یعنی ان ممتاز قریشیوں میں سے ایک جنہوں نے ابھی ابھی بدؔر میں ذلّت آمیز شکست کھائی تھی۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں جانا چاہتا تھا۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ اسے اندر بھیج دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اسے آزادانہ اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس کی تلوار کے پرتلے سے اس کی مشکیں کسیں اور انصار سے کہا کہ اسے اسی حالت میں حضورؐ کی خدمت میں لے جاؤ اور وہاں چوکنّے

رہو کہ اس قسم کے دشمنوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

ہرمزان نے عمیر بن وہب سے بھی زیادہ ذلّت آمیز شکست کھائی تھی اور جس پُرفریب طریقہ سے اس نے اپنی جان بچائی تھی وہ بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں تھا۔ پھر کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی بلکہ اسے اتنا قریب کرلیا کہ اس سے امورِ مملکت میں مشورے بھی لیتے رہے۔

آپؓ نے حکم دے رکھا تھا کہ بالغ قیدیوں کو مدینہ میں نہ آنے دیا جائے (حالانکہ بعض صحابہ بالخصوص حضرت عباسؓ چاہتے تھے کہ ایرانی قیدیوں کو مدینے آنے دیا جائے لیکن آپ نے اس کی سخت مخالفت کی تھی)۔ لیکن اس کے باوجود، فیروز کو مدینہ آنے کی اجازت دے دی اور اس کی نقل وحرکت پر کوئی نگاہ نہ رکھی — اگر عام حالات میں اس ضرورت کا احساس نہیں ابھرا تھا تو ہرمزان، جفینہ، فیروز وغیرہ کی خفیہ ملاقاتوں سے تو اس اندیشہ کو بیدار ہوجانا چاہئے تھا۔ حیرت ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا؟ لیکن ہم آج اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں جب کہ حقیقت تک پہنچنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ ذریعہ تو لے دے کے تاریخ ہی ہے اور تاریخ جس سطحی طور پر اس حادثہ کے آگے گزر گئی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

تاریخ کے بعض بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بعض گوشوں کی طرف سے، مبہم طور پر ہی سہی، اس ہونے والے حادثہ کے متعلق اشارات کئے گئے ہیں۔ (مثلاً) جبیر بن معطم کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے آخری حج میں، میں ان کے ساتھ تھا۔ ہم جبلِ عرفات پر کھڑے تھے کہ ایک شخص نے پکارا، یا خلیفۃ الرسول اللہ، پھر کہا یا امیر المومنین! بنولہب کے ایک بدو نے سُنا تو کہا کہ کون چلّا رہا ہے، واللہ، امیر المومنین اس سال کے بعد، جبلِ عرفات پر کبھی کھڑے نہیں ہوں گے۔ جب صبح ہوئی تو رمی الجمار کے وقت ایک کنکر آپ کے سر پر آ کر لگی جس سے ایک رگ پھٹ گئی۔ میں نے اُسی شخص کو پھر دامنِ کوہ سے کہتے ہوئے سنا کہ اس سال کے بعد امیر المومنین یہاں کبھی نہیں ٹھہریں گے۔

عینیہ بن حصن نے آپ سے کہا کہ ''یا تو آپ اپنی حفاظت کیجئے یا اہلِ عجم کو مدینہ سے باہر نکال دیجئے کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ ان میں سے کوئی آپ پر وار نہ کردے''۔

سب سے اہم روایت آپ کی زوجہ، مطہرہ (حضرت علیؓ کی صاحبزادی) حضرت اُمّ کلثومؓ کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ کعب احبار کہتا ہے کہ آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے کعب کو بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! جلد بازی سے کام نہ لیجئے، ذی الحجہ ختم نہیں ہوگا کہ آپ جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ آپؓ نے فرمایا کہ تم کبھی کہتے ہو جہنم میں، کبھی کہتے ہو جنت میں۔ اس نے کہا کہ یا امیر المومنین! ہم کتابِ خداوندی میں آپ کو جہنم کے دروازے پر پاتے ہیں کہ آپ لوگوں کو اس میں گرنے نہ دیں پھر جب آپ کی وفات ہوجائے گی تو لوگ قیامت تک جہنم میں دھڑا دھڑ گرتے جائیں گے۔ اس کے بعد وہ ایک دن پھر حاضرِ خدمت ہوا اور کہا کہ امیر المومنین! آپ وصیت کردیجئے کیونکہ آپ تین دن کے اندر اندر وفات پاجائیں گے۔ آپ نے کہا کہ تمہیں

کیسے معلوم ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کتابِ خداوندی میں ایسا لکھا پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تورات میں عمرؓ ابن خطاب کا ذکر ہے! اس نے کہا کہ آپ کے نام سے تو آپ کا ذکر تورات میں نہیں لیکن اس میں جو قرائن و شواہد اور حلیہ اور شمائل مذکور ہیں وہ بالکل آپ کے سے ہیں' اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ اس کے بعد دو دن متواتر آپ کے پاس آتا رہا اور جس صبح کو یہ ناشدنی واقعہ ہونا تھا اس سے پہلی رات کو آ کر واضح الفاظ میں کہا کہ اب وقت باقی نہیں رہا۔

کعب احبارؔ مدینہ میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اسلام تو نہیں لایا تھا' لیکن نبی اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی عام مسلمانوں اور امیر المومنین سے خلا ملا رکھتا تھا[1]۔ جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا فیصلہ ہو گیا تو پھر اسلام لے آیا۔

جو روایات اوپر درج کی گئی ہیں ہم ان کی بالکلیہ صداقت کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے خلاف سازش کی بھنک' ان لوگوں نے پالی تھی' لیکن وہ علانیہ' یا غیر مبہم طور پر اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے اشارات و کنایات کے پردوں میں حضرت عمرؓ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ کعبؔ احبار نے اسے جو کتابِ خداوندی کا مقدس نقاب اوڑھایا ہے تو اس سے بھی غالباً اس کا مقصد یہی تھا کہ حضرت عمرؓ تک وارننگ بھی پہنچ جائے اور وہ (کعبؔ) اس کے لئے (COMMITTED) بھی قرار نہ پائے۔ (اگرچہ ایک اور مصری مؤرخ عباس محمود العقادؔ کی رائے یہ ہے کہ خود کعبؔ بھی اس سازش میں شریک نظر آتا ہے۔ ہم ان کی اس رائے سے بھی متفق نہیں' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ خود آ کر حضرت عمرؓ کو اس قسم کی وارننگ کیوں دیتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اسے اس کا علم تھا لیکن وہ بعض مصالح کی بنا پر متعیّن طور پر اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا)۔

اگر ان روایات میں کچھ بھی صداقت ہے تو حیرت ہوئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان انتباہات کو بھی درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے صاحبِ عزیمت انسان کو جب زندگی میں اس قدر محیر العقول کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں تو اس میں اس حد تک خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے لئے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بہر حال' یہ حضرت عمرؓ کی (ضرورت سے زیادہ) خود اعتمادی تھی یا آپ کی حفاظت کے سلسلہ میں آپ کے رفقاء کی عدمِ احتیاط' نتیجہ اس کا نوعِ انسان کے لئے ایک ایسا عالمگیر نقصان ہے جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے عالمِ انسانیت میں صفِ ماتم بچھ گئی' اور نامعلوم ابھی یہ صفیں کب تک بچھی رہیں!

اور نچوڑ اس داستانِ خونچکاں کا یہ کہ ایرانؔ نے مسلمانوں کے ہاتھوں جو اِس قدر ذلّت آمیز شکست کھائی تھی' یہ اس کے انتقام کا پہلا قدم تھا ـــــ اس کے بعد کے اقدامات کے لئے چودھواںؔ باب دیکھئے۔

ماخوذ از شاہکارِ رسالتؐ

1۔ حضرت عمرؓ کے بیت المقدس کے دورہ کے وقت' کعب احبارؔ سے آپ نے جو کچھ فرمایا تھا' وہ اُس مقام پر درج کیا جا چکا ہے۔

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ یونس (آیات 46 تا 58)

درسِ قرآن

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿٤٦﴾
وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا
الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا
جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا
مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنتُم بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ
قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنبِئُونَكَ أَحَقٌّ
هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ
بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٥٤﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ
تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥٨﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1973ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی آیت 46 سے ہو رہا ہے۔ (10:46)

بسلسلہ تجدیدِ یادداشت:

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں اور اس سے بھی پیوستہ میں بات یہ چلی آ رہی تھی کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریقہ کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں، جلدی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب یہ غلط ہے، یہ جھوٹ ہے۔ تو اس کے لیے بتایا تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ یہ اس کے حقائق اور معارف علمی سطح پر سمجھنے کی چیز ہے۔ تو یہ انہیں علم و بصیرت کی رو سے نہیں سمجھتے، یونہی دھاندلی سے نہ کرتے چلے جاتے ہیں یا اپنے سابقہ متواتر عقائد اور

نظریات جو چلے آتے ہیں جن کی بنیاد علم و بصیرت نہیں ہے۔ چونکہ یہ ان کے خلاف ہیں اس واسطے ان سے انکار کرتے ہیں۔ بہر حال یہ چیزیں تفصیل سے ہو گئی تھیں۔ ایک بات ان میں یہ تھی کہ دوسرا طریقہ یہ ہے ان سے کہو کہ میں جو نظریات پیش کر رہا ہوں ان کو عمل میں لانے کے لیے میرے پاس عملی پروگرام ہے میں اس پہ عمل پیرا ہو رہا ہوں۔ تم مجھے اس کی اجازت دو کہ میں اپنے طور پر اس پر عمل کروں تم اپنے طور پر اپنے نظریات پر عمل کرو نتائج خود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ صحیح ہے کون غلط کہتا ہے۔ یہ جسے Pragmatic Test کہتے ہیں کہ نتائج کے ذریعے سے کسی پروگرام کے عملی ثمرات کے ذریعے سے اس نتیجے پہ پہنچنا کہ وہ ٹھیک ہے یا غلط ہے۔ اس پہ بڑی اہمیت دی گئی تھی۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ (6:135) کہ تم اپنے طور پر کام کیے جاؤ مجھے اپنے طور پر کام کرنے دو نتائج خود بتا دیں گے کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ بڑا ہی مؤثر اور اہم اور مبنی علی الحقیقت ایک دعویٰ ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک چیز تھی وہ بھی اس کے لیے تیار نہیں تھے اور یہ بھی اس لیے سامنے جلدی سے نہیں لا سکتے تھے کہ وہ جو فطرت کا طریقہ ہے کہ بیج بونے میں اور فصل پکنے میں ایک درمیانی عرصہ ہوتا ہے ایک وقفہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جو جھٹلاتے تھے وہ یہ کہتے تھے کہ تم یہ جو روز دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی تم یہ کہہ رہے ہو تو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ اس کے الٹ ہو رہا ہے ظالم تو پنپتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ کہتے تھے آ کر۔ ادھر سے جسے کہا جاتا تھا اس کی بھی صورت یہ نہیں تھی کہ وہ آ کر کہیں اور یہ کچھ اسی طرح سے نظر بٹو کو پھیرے اور اس کے بعد نتیجہ سامنے لے آئے۔ یہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بھی انتظار کرنا ہوتا تھا اس وقت تک کا۔ اور یہ واقعی یہ چیز جو ہے آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی کچھ دھاندلیاں زیادہ ہوتی ہیں یہ اعتراض بھی بہت ابھر کر سامنے آ جاتا ہے کہ صاحب قرآن یہ کہتا ہے کہ ان کو کامیابی نہیں ہو سکتی یہ تباہ ہو جاتی ہیں برباد ہو جاتی ہیں۔ قومیں جب اس قسم کے احوال و کیفیات میں سے گذرتی ہیں تو اس کے بعد اس نے سابقہ قوموں کی مثالیں دی ہیں کہ اس طرح تباہی آئی اس طرح سے یہ ہوا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب یہاں تو کسی کا کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے بلکہ روز بروز یہ لوگ اور زیادہ مرفع الحال ہوتے جاتے ہیں یہ غریب بے کس بے بس اور پستے چلے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات ابھر کے آ جاتے ہیں سامنے۔ اُدھر سے بھی آتے ہیں اِدھر سے بھی بہر حال جو شخص ایک پروگرام کو لے کر نکلا ہے اسے عمل میں لانے کے لیے اس قدر مشکلات اس قدر دشوار گذار راستوں سے اسے گذرنا پڑتا ہے اور اس پہ ایک لمبا عرصہ لگ جاتا ہے۔ فطری طور پر دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا اللہ مجھے ایمان تو ہے یقین تو ہے اس پہ کہ یہ کھیتی پکے گی نتائج برآمد ہونگے۔ تو کیا میری ساری عمر انہی مشکلات میں گذر جائے گی یا یہ میرے سامنے نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ سامنے نتیجہ دیکھنے کی آرزو بڑی فطری ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ ایسا ہو جائے۔

چشمے کے صاف و شفاف بہتے ہوئے پانی کی مانند انسانیت کے امام نبی اکرم ﷺ کی 40 سالہ زندگی کے چند ایک نشانات

نبی اکرم ﷺ نے اس دعوے سے پہلے کی چالیس سالہ زندگی اندازہ لگایئے اس زمانے میں دولت معیارِ تکریم یا عزت

نہیں ہوتا تھا' کریکٹر ہوتا تھا۔کریکٹر کے اعتبار سے زندگی کی یہ کیفیت کہ سارا معاشرہ آپ کو امین کہتا تھا' اپنے معاملات میں آپ کو ثالث مقرر کیا کرتا تھا۔قبائل کے بڑے بوڑھے بھی آتے تھے جس معاملے میں تنازع ہوتا تھا' اختلاف ہوتا تھا ان سے اس کا حل چاہتے تھے۔تو گویا معاشرے میں ایک بڑی معزز حیثیت تھی۔کوئی تکلیف نہیں تھی' کوئی دکھ نہیں تھا' گھر میں آسائش تھی' آرام تھا' جنتی زندگی تھی۔

نبوت ملنے کے بعد مصائب وآلام سے بھرپور زندگی اور
پھر دل میں مچلنے والی ایک معصوم سی آرزو کا ذکر اور اس کا جواب

لیکن جب نبوت نے دعوت شروع کی چاروں طرف سے مخالفتیں ہجوم کر کے آ گئیں۔وہی معاشرہ کہ جو چالیس سال تک اتنی عزت کرتا چلا آ رہا تھا انہوں نے وہاں جینا دوبھر کر دیا۔پتھر پڑ رہے ہیں گالیاں دی جا رہی ہیں الزامات تراشے چلے جا رہے ہیں۔حتیٰ کہ وطن چھوڑ دینا پڑا' گھر بار چھوڑ دینا پڑا' عزیز رشتہ داروں نے ساتھ چھوڑ دیا۔آپ سوچیے کس قدر صبر آزما یہ مراحل ہوتے ہیں۔اور اگلی بات یہ کہ وہ جس پروگرام کو لے کر نکلے ہیں اس کے بھی نتائج محسوس شکل میں ابھی سامنے نہیں آ رہے۔بڑا اہمت طلب تھا مرحلہ یہ۔تو اس معصوم سی آرزو کا دل میں مچل جانا کہ یا اللہ میری ساری عمر اسی طرح سے یہ مار کھاتے ہوئے گذر جائے گی یا وہ میری آنکھوں کے سامنے بھی سامنے آئے گا۔یعنی یہ نہیں کہ اس میں یقین نہیں رہا کہ آئے کہ نہ آئے' آئے گا تو ضرور۔صرف اتنی سی بات تھی کہ میرے سامنے یہ ہو جائے گا یا نہیں ہو جائے گا۔تو یہ چیز وہ جو پہلی آیتیں گذری ہیں آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں فطری ربط ہے اس آرزو کا۔تو قرآن کا تو انداز یہ ہے کہ وہ چیزیں مسلسل بیان نہیں کرتا Gaps درمیان میں چھوڑتا ہے کہ تم اپنی بصیرت سے ربط قائم کرتے ہوئے Gap کو Fill in کرو۔یہ الفاظ تو حضور ﷺ کے یہ آرزو اس کا تو اظہار نہیں الفاظ میں آیا جواب آیا ہے اس کا کہ اچھا یہ بات تمہارے دل میں بیدار ہوئی ٹھیک ہے ہونی چاہیے۔لیکن ہم تو کسان کی ہزار آرزوؤں کے باوجود یہ کبھی نہیں کرتے کہ جس فصل کے پکنے میں چھ مہینے لگنے ہیں وہ پانچ مہینے میں پک کے سامنے آ جائے۔کسان روز دعائیں مانگتا ہے' یہی نہیں' کسان کے بچے بھوک سے مر رہے ہیں ان کی خاطر ہی یہ کر دیا جائے کہ صاحب وہ چار مہینے میں پک کے گھر آ جائے۔ہم تو یہ نہیں کیا کرتے۔یہاں تو ہر چیز قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے اور کسی کی آرزو وہ کتنی ہی معصوم اور مقدم کیوں نہ ہو اس کی خاطر بھی ہم اس میں تبدیلی نہیں کیا کرتے۔وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (10:46) تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ یہ نتائج تمہاری زندگی میں سامنے آتے ہیں یا تمہارے مرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔یہاں تو آگے یہ کہا کہ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (10:46) یہ بات کہ خدا جیسا ایک قادرِ مطلق دیکھ رہا ہے کہ یہ کیا کر رہے ہیں تمہارے لیے یہ کافی ہونا چاہیے۔یہ تمام جو کچھ یہ کر رہے ہیں ان کے تمام پروگرام نے ان کی تمام حرکات وسکنات نے پلٹ کر آنا ہے اسی ہمارے قانونِ مکافات کے نقطے پر اور اسکے مطابق اس کا نتیجہ مرتب ہونا ہے۔اس لیے تمہیں اس میں

گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ باقی رہا یہ کہ صاحب تمہاری زندگی میں ہو جائے یا وہ تمہارے بعد ہوگا۔ عزیزانِ من ! حضور ﷺ تو ایک طرف آج ہمارا بھی یہ جی چاہتا ہے کہ اتنی لمبی مصیبتیں مشقتیں گذارنے والے مزدور کو اتنا تو کہہ دیا جاتا کہ خیر کوئی بات نہیں تمہارے سامنے یہ سامنے آ جائے گا۔ لیکن میں نے کہا ہے نا کہ خدا بننا تو جچتا ہی اسے ہے کہ جو جذبات میں نہ آ جائے۔ میں نے کہا ہے کہ موقعہ ہی ایسا ہے کہ آج ہمارے ذہن میں یہ بات اٹھتی ہے کہ اتنی سی بات تو ہونی چاہیے نا۔ جواب اس کا ہے' یہی الفاظ ہیں سورۃ الرعد کی آیت 40 ویں۔ غور کیجیے جواب کیا ملتا ہے۔ وَاِنۡ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ﴿۴۰﴾ (13:40) وہی الفاظ ہیں۔ تمہاری زندگی میں یہ نتائج سامنے آ جائیں یا تمہاری وفات کے بعد سامنے آئیں تمہیں اس سے غرض نہیں ہے۔ سنیے کہا کیا ہے۔ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ﴿۴۰﴾ (13:40) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس آواز کو پہنچائے چلا جا پہنچائے چلا جا یہ کہ یہ نتائج کب بر آمد کرے گی اس کا حساب کرنا ہمارے ذمہ ہے تمہارے ذمہ نہیں ہے۔ غور فرمایا آپ نے۔ اپنے فریضے کو ادا کرتے چلے جاؤ۔ یقین تو ہے نا تمہیں کہ یہ نتائج مرتب ہونگے۔ بات تو اتنی ہی کہتے ہو نا تم کہ کب سامنے آئیں گے۔ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ﴿۴۰﴾ (13:40) اس کے لیے قانون ہے ہمارے ہاں' اس قانون کی رو سے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہم حساب کر رہے ہیں کتنے دن ابھی باقی ہیں فصل کے پکنے میں۔ اسے ہم پہ چھوڑو۔ عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ (13:40) تمہارے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے یا تم نے اپنے ذمہ جو فریضہ لیا ہے تم اسے ادا کرتے چلے جاؤ اس یقین کے ساتھ کہ اس کا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ یہ کہ وہ کب نکلے گا نتیجہ یہ ہمارے حساب کے مطابق ہوگا۔ یہ جواب ملتا ہے عزیزانِ من !۔ نظر بظاہر خاصا ہمت شکن ہے یہ کہ مجھے کیا ملے گا۔ لیکن جب یقیں محکم ہو تو پھر ہمت نہیں ٹوٹتی۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا جواب ایک نفسیاتی پہلو لیے ہوئے ہے:

اب یہ بات کہ میری زندگی میں نہیں ہوگا اس کے متعلق قرآن نے ایک ایسی نفسیاتی چیز کہی ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ یہ جو اتنی بڑی ہوس ہے کہ میری زندگی میں سامنے آئے یہ تو وہی کہے گا کہ جو سمجھے کہ موت کے ساتھ میرا خاتمہ ہو جانا ہے۔ اور جب ایمان یہ ہے کہ زندگی جو ہے مسلسل چلنی ہے موت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی میں نے تو اس کے بعد بھی زندہ رہنا ہے۔ تو جب کیفیت پھر یہ ہے کہ تو نے مرنا ہی نہیں ہے تو پھر یہ تمہارے دل میں کیوں خیال پیدا ہو رہا ہے۔ ہمارے متعلق جو تم کہتے ہو کہ بڑے بڑے لمبے دن خدا کے ہوتے ہیں جلدی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے نا کہ ہم نے مرنا نہیں ہے۔ کرنے کو تو ہم ایک دن میں یہ کر سکتے ہیں۔ مشکل کیا ہے؟ جس نے ایک کن کہنے سے اتنی بڑی کائنات وجود میں لے آیا' کیا مشکل ہے کہ ادھر ڈالے گیہوں کا دوسرے دن فصل پک کے سامنے آ جائے۔ ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم دیکھتے ہو کہ ہم یہ اس طرح نہیں کرتے۔ مقرر کیا ہوا قاعدہ ہے اس کے مطابق وہ چیز اگتی ہے پھلتی ہے پھولتی ہے اتنا وقت لیتی ہے۔

اگر زندگی کا پیمانہ بدل دیا جائے تو اضطرابی کیفیت بدل جاتی ہے:

تو یہ جو ہمارے ذہن میں اضطراب نہیں پیدا ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مرنا نہیں ہے۔ تو جب تمہیں بھی یقین یہ آ جائے کہ تم نے مرنا نہیں ہے تو پھر تم اس سے مایوس نہیں ہو گے کہ یہ میری زندگی میں سامنے آتا ہے یا نہیں۔ زندگی کا پیمانہ بدل دو یہ اضطراب ختم ہو جائے گا۔ کیا بات ہے صاحب !!!۔ قرآن تو عزیزانِ من ! انسان کو چھوٹے پیمانے میں خدا بنا دیتا ہے اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ مقام کیا دیا ہے۔ واقعی کام کرنے والا تھک کے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ وہ بے تابی ہے

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

یہ جو اضطراب ہے نا کہ

دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

یہ اسی کے لیے ہوتا ہے کہ جسے یہ معلوم ہو کہ اس کے بعد میں نہیں رہونگا۔ اس کے بعد 'پس از اں کہ من نہ مانم بچ چہ کار خواہی آمد' میں ہی نہیں رہونگا تو پھر آ ؤ گے تو کیا ہوگا۔ وہ کہتا ہے تمہارے دل میں یہ خیال ہی نہیں پیدا ہو سکتا کہ میں نہ رہونگا' تم نے مرنا ہے کہیں؟ تم نے تو زندہ رہنا ہے۔ اس واسطے یہ جو پیمانہ ہے یہاں سامنے آئے گا یا نہیں آئے گا اس کے لیے تمہیں مضطرب و بیقرار نہیں ہونا چاہیے۔

قرآنِ حکیم کا فلسفۂ حیات تو انسان کے تصورات کو ہی بدل دیتا ہے:

دیکھتے ہیں عزیزانِ من ! کہ یہ جو قرآن کو ماننے والا مردِ مومن ہے اس کی زندگی کے یہ تصورات کیسے بدل دیتا ہے۔ اتنی سی بات کہ صاحب میری زندگی میں سامنے نہ آیا میں مر گیا مشقتیں کرتا کرتا مجھے کیا ملا۔ یہ تصور ہی ذہن سے اٹھ جاتا ہے اس کے۔ یقین یہ ہونا چاہیے کہ جس پروگرام کو لے کے میں اٹھا ہوں یہ صداقت پر مبنی ہے نتائج مرتب ہونگے۔ میری زندگی میں ہو جائیں تو کیا بعد میں ہو جائیں تو کیا۔ حالانکہ بڑے بڑے اربابِ عزم جو ہیں وہ بھی اس مقام پہ کئی دفعہ ہمتیں ہار دیتے ہیں کہ نہیں صاحب نہیں ہوتا۔ آخری وقت میں پھر وہ آ جاتے ہیں کہ چلو اللہ اللہ ہی کریں۔ مایوسی کا نام رہتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس کی بناء پہ قرآن کہتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53) یہ جو ہے رحمت اللہ سے قنوط' یہ کیسے ہوتا ہے؟ وہ یہی چیز چاہتا ہے نا کہ میری زندگی میں یہ سامنے آ جائے۔ پروگرام ایسا ہو کہ جس کی صداقت پہ یقین ہو کہ نتائج نکل کے رہیں گے اور اس کے بعد یہ چیز کہ میں نے تو مرنا ہی نہیں ہے' مایوسی آ ہی نہیں سکتی عزیزانِ من !۔ بڑی عظیم چیز ہے جو قرآن اس میں کہہ گیا ہے۔ وہ جب ایسی ذاتِ اقدس و اعظم کو جو خدا سے قریب ترین محبوب ترین جسے ہم کہتے ہیں اسے یہ جواب مل رہا

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (2:228) قانونِ خداوندی کی رُو سے' مرد اور عورت کے حقوق و فرائض یکساں ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص: 87)

ہے تو دوسرے جو ہیں کہ ان کے لیے خدا اپنا قانون بدل دے گا' حساب بدل دے گا کہ ہاں صاحب ہم نے تو مر جانا ہے جلدی جلدی ہمیں کچھ کر کے دکھا دیجیے۔ یہ جو نشاطِ کار ہے یہ ان چیزوں کے اندر خوشی کہ نتیجہ میرے ہی سامنے آ جائے یہ تو اسی کے لیے ہے کہ جس نے موت کے متعلق سمجھنا ہو کہ اس سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ مرنے والا جو ہے اس کو کبھی یہ اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ کہا قاعدہ ہے قانون ہے۔ سنو کیا قانون ہے؟

قانونِ خداوندی یہ ہے کہ وہ کسی کو غلط راستے سے آگاہ کیے بغیر یونہی تباہ نہیں کرتا:

پہلی بات یہ کہ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴿۴۷﴾ (10:47) پہلی چیز تو یہ ہے کہ غلط چلنے والوں کے سامنے ان کو وارننگ دینے والا آنا چاہیے وارننگ ملنی چاہیے ان کو تنبیہ ہونی چاہیے کہ یہ غلط راستہ ہے جس پہ تم چلے جا رہے ہو۔ قرآن نے متعدد مقامات پہ کہا ہے کہ ہم یونہی کسی امت کو تباہ کر دیا کرتے تاوقتیکہ انہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ ہم جس راستے پہ جا رہے ہیں غلط ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ جب تک نبوت کا اجراء تھا اس زمانے تک رسول آتا تھا' ختمِ نبوت ﷺ کے بعد رسالت باقی ہے حضور ﷺ کی' قرآن باقی ہے قیامت تک۔ اس کے معنی یہ ہیں' یہی ہے رسالت پیغام' یہ باقی ہے۔ غلط چلنے والی قومیں جو ہیں آج یہ نہیں کہہ سکتیں کہ ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ تو کہا یہ کہ ایک تو یہ ہے کہ ان کو یہ علم ہو جانا چاہیے۔ جب یہ علم ہو جاتا ہے وارننگ مل جاتی ہے اس کے باوجود وہ قوم صحیح راستے پہ نہیں چلتی۔ اب دیکھیے جسے عام الفاظ میں تو اتمام حجت اسے کہتے ہیں۔ اتمامِ حجت نہیں ہے بلکہ یہ بڑا ہی انصاف کے مطابق ہے یہ کہ غلط چلنے والے کو یہ تو بتا دیا جائے کہ راستہ غلط ہے۔ یہیں سے قانونی ایک چیز سامنے آتی ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جب تک ایک بتانے والا نہ آئے ہم قوم کو ہلاک نہیں کرتے۔

سب سے پہلے مملکت کو قانون کی تشہیر کرنا لازم ہوگی تاکہ لوگ اس سے آگہی حاصل کریں:

قانونی نقطہ یہ ہے کہ قانون ملک کا جو ہے اس کی اس طرح سے تشہیر ہونی چاہیے کہ ہر فرد کو معلوم ہے کہ قانون کیا کہتا ہے۔ غلط معاشرے کے اندر پہلی چیز یہ ہے کہ وہ قانون اس کا پتہ ہی نہیں چلتا کسی کو۔ وہ کیا ہے کب بن گیا پھر اس کے بعد جو Ammendments ہوتی ہیں ان کے متعلق پتہ نہیں۔ اچھے اچھے Lawers جو ہیں ان کو معلوم نہیں ہوتا عوام کو تو ایک طرف رہا۔ کوئی مشینری ایسی نہیں ہوتی کہ جس کے ذریعے سے ہر فرد تک یہ بات پہنچ جائے کہ قانون کیا کہتا ہے۔ یہ ہوتی نہیں اور قانون یہ کہتا ہے کہ Ignorance of Law is no execuse یہ کہ صاحب اس قانون کا ہمیں پتہ نہیں تھا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہوسکتا۔ قرآن کا جو عدل کا بنیادی تصور ہے اس میں یہ بات ہے کہ یہ بات پہلے پہنچائی جانی چاہیے کہ غلط کیا ہے صحیح کیا ہے۔ پھر اس کے بعد آگے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (10:47) عجیب چیز ہے یہاں۔ میں نے کہا تھا نا کہ قانونی نقطہ۔ وہ کہتا ہے انصاف کے مطابق پھر فیصلہ ہوتا ہے اور انصاف کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ قانون کیا ہے' میں اس کی خلاف ورزی کر رہا ہوں یا اس کے مطابق چل رہا ہوں۔ قُضِيَ بَيْنَهُمْ

بِالۡقِسۡطِ (10:47) قانون کا تقاضا پورا نہیں ہوتا اگر اس طرح سے قانون کی تشہیر نہ کی جائے کہ ہر فرد کو معلوم ہو کہ قانون کیا کہتا ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں دورِ اول تو ایک طرف رہا وہاں تو یہ ایسا انتظام تھا اس کے بعد کا زمانہ بھی جو ہمارا تھا جب پچھلے نقوش ابھی چلے آ رہے تھے۔

قانون سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے مملکت کی طرف سے بغیر کسی فیس کے کچھ افراد کا مقرر ہونا مفتی کہلاتا تھا

مملکت کی طرف سے جسے اب مفتی کہتے ہیں نا ''ایہ مفت دیاں کھان والائیں سی ہوندا'' یہ گورنمنٹ کی طرف سے حکومت کی طرف سے Institute ہوتی تھی یہ کہ ہر فرد معلوم کرنا چاہے کہ فلاں معاملے میں قانون کیا کہتا ہے تو وہ وہاں جا کے ان سے معلوم کر سکتا تھا بغیر معاوضے کے۔ قانون کا تو اس زمانے میں معاوضہ ہوتا ہی نہیں تھا دینا ہی نہیں پڑتا تھا۔ یعنی یہ گورنمنٹ کی طرف سے حکومت کی طرف سے یہ مقرر ہوتے تھے کہ وہاں جا کے وہ یہ پوچھ لے کہ جی فلاں معاملے میں قانون کیا کہتا ہے۔ قاضی نہیں وہ ہوتے تھے وہ اس کے Particular Case میں فیصلے نہیں دیتا تھا وہ شخص۔ وہ صرف یہ بتاتا تھا کہ ایسے معاملے میں قانون کیا ہے۔ وہ اس کے لیے تھا کہ قرآن نے یہ شرط عائد کر رکھی ہے قُضِيَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ قسط کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے رسول آئے۔ اب دیکھا کس کس انداز سے قرآن بات کرتا ہے۔ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ (10:47) یوں کیا جائے گا تو اسے آپ ظلم نہیں کہہ سکتے کہ جی پتہ ہی نہیں کوئی بتایا ہی نہیں کوئی انتظام ہی نہیں مجھے معلوم ہی نہیں تھا اور یونہی میرا ٹینٹوا دبائے جا رہے ہیں۔ بِالۡقِسۡطِ اس وقت ہوتا جب پہلے رسول آئے گا۔ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ یوں ہوگا وہ۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۝۴۸ (10:48) کہا یہ ٹھیک ہے تمہارے جی میں بھی یہ آرزو مچلی۔ لیکن یہ تو اعتراض کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ کہیے جو تم کہتے ہو تباہی آئے گی تخریب ہوگی گرفت ہوگی' کب ہوگی یہ؟ مَتٰى کا وقت آ گیا۔ پوچھا جاتا ہے رسول سے جو روز ان سے کہتا ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ٹھیک ہے۔ کسی نیت سے بھی پوچھتے ہوں بہر حال وہ یہ پوچھتے ہیں کب ایسا ہوگا۔ کہا مجھ سے پوچھ رہے ہو۔

مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ تباہی کب آئے گی مجھے تو اپنے متعلق بھی غیب کا علم نہیں:

عجیب چیز ہے آگے جو کہی گئی ہے۔ کہا میں تمہیں بتاؤں میری حیثیت کیا ہے اس معاملے سارے کے اندر' میری حیثیت یہ ہے کہ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا (10:49) تم تو ایک طرف رہے میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع اور نقصان کا کوئی اقتدار اور اختیار نہیں رکھتا چہ جائیکہ تمہارا متعلق میں فیصلہ دیدوں کہ ہاں صاحب' پرسوں مارے جاؤ گے تم۔ اور دوسری چیز اس میں دوسرے مقامات پہ قرآن نے یہ کہا ہے لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا (7:188) رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے تمہیں غیب کا علم نہیں کل کیا ہونے والا ہے مجھے بھی نہیں علم۔ نفع اور نقصان سے وہ بچتا ہے نفع وہ زیادہ کماتا ہے جسے ذرا پہلے پتہ لگ جائے۔ آپ کو معلوم ہے ذرا پہلے پتہ لگنے سے کیا کیا کچھ نہیں

ہو جاتا۔ یہ بجٹ اناؤنس کرنے سے پہلے پہلے کتنے یہ گدھوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں ان ایوانوں کے کہ کہیں سے بھنک کان میں پڑ جائے کہ کس چیز کے اوپر ٹیکس نیا لگنے والا ہے۔ اتنی سی انفرمیشن جو ہے وہ سیل ہوتی ہے جب لاکھوں میں بکتی ہے۔ ذرا سا پہلے پتہ چل جائے۔ یہ ساری کرامات یہ ساری مزاریں یہ سارے ننگ دھڑنگ کھاتے اسی چیز کا ہیں کہ ذرا مجھے پہلے پتہ لگ جائے یہی پوچھتے ہیں نا جا کے۔ تو یہ مقربین کہلاتے ہیں جو پہلے کچھ بتاتے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا مقرب جو ہے کائنات کے اندر سب سے بڑا مقرب انسان ﷺ وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اپنے متعلق بھی پتہ نہیں کہ کل میرے ساتھ کیا گذرنے والی ہے۔

لفظ الا ماشآء اللہ کا وہ حقیقی تصور جس کے تحت وہ یہ لفظ استعمال کرتے تھے:

کیا بات ہے عزیزانِ من !!۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (10:49) کچھ بھی خدا کے قانون کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ یہ میں ضمناً عرض کر دوں یہ جو Construction ہے الا ماشاء اللہ کی۔ پہلے تو اسے سمجھ لیجیے کہ یہ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس زبان میں جو محاورے جو انداز جو تراکیب جو الفاظ تھے قرآن سمجھنے کے لیے پہلے ان کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہ جو Construction ہے الا ماش آ ء اللہ' عربوں کے ہاں موجود تھی اور یہ اس وقت کہتے تھے جب اس میں انہوں نے کہنا ہو کہ حتمی طور پر یہ بات ہے یقیناً ایسا ہے۔ یہ Construction تھی۔ یہ جو ترجمہ ہے نظر بجز اس کے کہ جو اللہ چاہے یہ ہمارا آپ کا ترجمہ ہے۔ عرب یہ ترجمہ نہیں کرتے تھے اس کا' وہ کہتے یہ تھے کہ حتمی طور پر ایسا ہی ہوگا۔ قرآن نے آگے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ اس لیے ہوگا کہ ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی ہے اور قانون کو ہم بدلتے نہیں ہیں۔ اس لیے الا ماش آ ء اللہ کے معنی یہ متعین ہو گئے اب 'خدا کے قانون کے مطابق جو بدلتا نہیں ہے'۔ تو بات وہی ہو گئی کہ یہ حتمی طور پہ ہوگا ایسا۔ ضمناً بات تھی۔ کہا پھر یہ چیز کہ صاحب یہ ظلم کرنے والے جو ہیں تباہ فوراً کیوں نہیں ہوتے۔ کہا اس لیے کہ وہ جو مشیت ہے خدا کا قانون ہے۔

لفظ ''مشیت'' کا اور اجل کا مفہوم:

پھر سمجھ لیجیے مشیت کے بھی وہ معنی نہیں جو ہمارے ہاں ذہنوں میں ہیں۔ ہمارے ہاں ذہن میں تو مشیت کے معنی ہیں نا جہاں قاعدہ قانون کچھ نہیں جسے ہم کہتے ہیں مرضی اللہ کی 'خدا کی مرضی ایسی تھی'۔ مشیت کے بھی یہ معنی نہیں ہیں مشیت کے معنی ہیں خدا کا وہ قانون جو وہاں بنا تھا جہاں ہماری رسائی نہیں ہے۔ قانون' قانونِ مشیت جب وہ اس کائنات میں آ جاتے ہیں تو وہ کہیں قانونِ فطرت کہلاتے ہیں کہیں وہ قوانینِ تمدنی زندگی کہلاتے ہیں جو قرآن کے اندر ہیں۔ اور وہاں جب تک خدا کے ہاں ہوتے ہیں انہیں قوانینِ مشیت کہا جاتا ہے۔ بہر حال۔ کہا اب تمہیں بتاؤں یہ کہ یہ بھی جلدی مچا رہے ہیں تمہارے دل میں بھی یہ آرزو ابھر رہی ہے کہ جلدی سے آئے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (10:49) وہ اجل تو ہمارے ہاں تو موت ہی کے لیے ہوتا ہے یہ لفظ۔

اگر ہر قوم کے لئے موت اور زندگی کی معیاد مقرر ہے تو ہر معیاد کے لئے بھی تو ایک قانون مقرر ہے:

اجل کے معنی اصل میں ایک معیاد ہوتی ہے ایک وقفہ ہوتا ہے جو بیج بونے میں اور پھل کے پکنے کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ اجل معیاد کو کہتے ہیں اور اس معیاد کا جو آخری لمحہ ہوتا ہے جہاں اس نے ختم ہو جانا ہوتا ہے اسے بھی اس کی اجل کہی جاتی ہے۔ وقفے کا ہر لمحہ اجل ہوتا ہے آخری لمحہ بھی اجل ہوتا ہے۔ کہا لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ (10:49) آ گئی پھر وہی تقدیر کا مسئلہ ہمارے ہاں مجوسیوں کا کہ صاحب قرآن کہتا ہے ہر قوم کی ایک اجل ہوتی ہے مقرر ہوتی ہے۔ تو یہ تو مقرر شدہ ہے بات کہ اس قوم نے اتنا عرصہ زندہ رہنا ہے اُس نے اتنا عرصہ زندہ رہنا ہے۔ اجل کا یہ ترجمہ پہلے۔ اتنی سی چیز لی لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ اور دوسری جگہ یہ نہ دیکھا عزیزانِ من! وہی تصریفِ آیات۔ لیجیے (13:38) ملایئے دونوں آیتوں کو۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ (10:49) ؕ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (13:38) ہر قوم کے لیے ایک معیاد ہوتی ہے اس کی موت اور زندگی کی اور ہر معیاد کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔ بات صاف ہوگئی۔ وہ ایک قانون مقرر ہے۔ اس قسم کے کام کرنے والی قوم یہ ہوگی۔ اس مرنے والے کے لیے بھی تو یہ صورت ہے بعض امراض ایسے ہوتے ہیں دس دس سال تک مرض چلتا چلا جاتا ہے ہر قدم اس کا اٹھ رہا ہوتا ہے موت کی طرف۔ لیکن موت آتی ہے پر نہیں آتی' وہ بھی اجل ہوتی ہے۔ ایک وہ بھی اجل ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب رات اچھا بھلا سویا صبح اٹھا تو مرا پڑا تھا۔ رات تو ایک طرف رہا وہ کہتے ہیں چلتے ہوئے یونہی گر پڑا مر گیا۔ اس کے لیے بھی قانون ہوتا ہے۔ تو جب کہا کہ قوموں کے لیے قانون ہے تو وہ دیکھنا یہ ہے کہ پھر وہ قومیں کس کس قسم کا کام کرتی ہیں۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ (10:49)۔ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (13:38)۔

خدا کی کتاب کے سلسلہ میں بہائیوں کے دعویٰ کی نوعیت اور تجزیہ:

ضمناً بات یاد آ گئی ہمارے ہاں یہ جو نبی آتے ہیں عجیب قسم کے جاہلِ مطلق ہوتے ہیں' یہ بہائیوں کے ہاں بھی دعویٰ کیا باب نے اور اس کے بعد بہا اللہ نے۔ وہ کہا یہ کہ صاحب جو کتاب آتی ہے خدا کی طرف سے اس کے لیے ایک پیریڈ ہوتا ہے صرف' ایک زمانہ ہوتا ہے اس زمانے تک کے لیے وہ کتاب زندہ رہتی ہے اس کے بعد پھر اس کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے کلینڈر رہوتا ہے 31 دسمبر کو ختم' ریلوے کے ٹائم ٹیبل ہر چھ مہینے کے بعد وہ بدلتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ ہر کتاب کے لیے ایک وقفہ ہوتا ہے اس کے بعد وہ اس کا پیریڈ ختم ہو جاتا ہے پھر ایک نئی کتاب آنی چاہیے۔ یہ ہے ان کے ہاں کا مؤقف۔ وہ اپنے ہر دعوے کو قرآن سے پیش کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرف یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ کلینڈر ختم ہو گیا تھا 31 دسمبر تک'' ویاہ دیاں تاریخاں اوسے کلینڈر نال متھ دے ہیگے'' دلیلیں اسی قرآن سے لاتے ہیں۔ دلیل یہ لائی گئی لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (13:38) ہر کتاب کے لیے ایک پیریڈ ہوتا ہے۔ اور قرآن میں ہے لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (13:38) ہر معیاد کے لیے ایک قانون ہوتا ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا لِکُلِّ کِتَابٌ اَجَلٍ یا یہ کہ قرآن کے متعلق کہیں یہ آیا ہو کہ اس کی بھی ایک

معیاد ہے ایک زمانہ ہے ایک پیریڈ ہے جس میں یہ رہے گا۔ وہ تو قیامت تک کے لیے دیا گیا ہے۔ بہر حال۔

زندگی اور موت کے غیر متبدل اصول جن کی آگہی از بس ضروری ہے:

ہر قوم کے لیے اس کے پروگرام اور اعمال کے مطابق۔ یہ کیا ہے جو اجل ہے۔ یہ وہ کشمکش کا زمانہ ہے جو زندگی اور موت کے درمیان مریض کے اندر جاری ہوتا ہے۔ ہلاک کرنے والے عناصر Attack کرتے ہیں مدافعت کرنے والے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کشمکش ہوتی چلی جاتی ہے۔ مقابلہ کرنے والوں میں جب تک قوتِ مدافعت رہتی ہے زندہ رہتے ہیں جس دن قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے شکست کھا جاتے ہیں۔ اُسے موت کہا جاتا ہے۔ جو کچھ آپ کے ہاں علاج یا طِب یا ڈاکٹر کرتا ہے وہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جو مدافعت کرنے والی اندر قوت ہے اس قوت کو اور مزید تقویت دیتا ہے وہ۔ یہ جو عرصہ درمیان میں رکھا گیا ہے عین عدل کے مطابق ہے کہ ان کو وارننگ دیے جاؤ یہ بتائے جاؤ مرض یہ ہے تمہارا۔ ہلاکت آفریں عناصر اس طرح سے تم پر مؤثر ہو رہے ہیں اس کی مدافعت کا یہ طریقہ ہے ان کو طاقت بہم پہنچانے کا یہ مداوا ہے کرتے چلے جاؤ۔ اس کے باوجود وہ اگر نہیں کرتا تو پھر ایک دن مدافعت کی قوتیں جواب دے جاتی ہیں اور یہ اس قوم کی پھر ہلاکت ہوتی ہے۔ کہا اس کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اس دوران میں تو ابھی اس کا چانس ہوتا ہے مہلت ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنی روش کو بدل لے تو پھر اس کا پلڑا مدافعت کا بھاری ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں آخری فیصلے کے لیے جو کہتے ہیں میزان کھڑی ہوگی قیامت میں' اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ایک ایک ذرہ غلط اور صحیح کا تولا جائے گا۔ وہاں بھی جو معیار مقرر کیا ہے قرآن نے فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ﴿۸﴾ (101:6-8) کہا ہے کہ پلڑا بھاری کونسا ہے۔ یہ جو ہلاکت آفریں کشمکش ہوتی ہے ہمارے اندر' کوئی بھی سانس لینے والا ایسا نہیں ہے جس میں یہ ہلاکت آفریں چیزیں اندر نہیں جاتیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ مدافعت کرنے والا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ جس کا یہ پلڑا بھاری ہوتا ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ انسان معصوم نہیں پیدا کیا گیا' اس سے لغزشیں ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا تخریبی کاموں کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے یا تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری ہے۔ قوموں کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ تخریب میں وہ اترتی ہیں اگر تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری رہتا ہے تو ان کو زندگی ملتی جاتی ہے۔ ابھی مہلت ہوتی ہے۔ جب یہ کیفیت ہو جائے کہ تخریبی پلڑا بھاری ہو جائے اور اس کے بعد پھر ان کی اجل آتی ہے۔ جب یہ وقت آ جاتا ہے تو کہا کہ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ فَلَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۴۹﴾ (10:49) پھر اس میں ایک لمحہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت پھر طبیب مریض کی بالی سے مایوس اٹھ جاتا ہے' No Hope' وہ کس وقت کہتا ہے No Hope؟ ابھی سانس تو آ رہا ہوتا ہے' جب وہ دیکھتا ہے کہ مدافعت کا پلڑا بہت اونچا چلا گیا ہے۔ یہ ہے جو قرآن نے اصول بتایا ہے اس کے مطابق کہا کہ تم بھی نہیں جلدی کر سکتے ہو نہ تمہاری آرزوؤں کی خاطر ہم جلدی سے ان کا پلڑا جھکا دیں گے' انصاف کے خلاف ہوگا۔ نہ ان کا یہ تقاضا کہ صاحب بتاؤ جلدی سے کر کے تب ایمان لائیں گے۔ کہا سوال ہی نہیں ہے۔ ہم نے ان کے ایمان سے کونسا ووٹ حاصل کرنا ہے کہ بل

پاس نہیں ہوگا ہمارا۔ وہ تو ان کی اپنی زندگی اور موت کا سوال ہے' ہم تو صرف قانون دینے والے ہیں۔ اس لیے نہ ان کے لیے نہ تمہارے لیے۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ (4:123) وہاں کہا ہے کہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہ تمہارے مخالفین کی آرزوؤں کے مطابق۔ نہ بھائی یہاں تو فیصلے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب وہ وقت آجاتا ہے کہا کہ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ۝۵۰ (10:50) کہا دوسری بات ان سے یہ پوچھو کہ اگر تو کوئی مریض یہ پوچھے طبیب سے روز کہ ڈاکٹر صاحب میں کب اچھا ہو جاؤنگا۔ تو اس کا یہ پوچھنا قابلِ التفات ہوتا ہے ہمدردی چاہتا ہے۔ اور اگر وہ روز یہ پوچھے کہ ڈاکٹر صاحب میں کب مرونگا مرتا کیوں نہیں ہوں۔ اب سوچو تو سہی اس کو کیا جواب دیں۔ آگے بات یہ کہہ رہے ہیں۔ کہا تم ان سے یہ کہہ رہے ہو کہ تمہاری روش ایسی ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ان سے پوچھو کہ کبھی کوئی مریض یہ پوچھا کرتا ہے اور یہ دن رات تم سے یہ پوچھتے ہیں کب تباہ ہونگے۔ ارے کم بختو کونسا وہ عید کا چاند ہے جو تم یہ کہتے ہو کہ صاحب نکلتا ہے انتیس کو یا نہیں نکلتا۔ او موت کا پیغام ہے اس کے جلدی مچا رہے ہو۔ مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ۝۵۰ (10:50) مجرم جس چیز کے لیے جلدی کر رہا ہے وہ کونسی چیز اس کے لیے ایسی باعثِ مسرت یا تشیدِ انبساط ہے جس کے لیے یہ روز کہتا ہے کہ بتاؤ صاحب کب آئے گا۔ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ (10:51) کہا کہ یہ ہے بات کہ روز پوچھتے ہو کہ صاحب اس وقت تو ہم تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے' جب موت آجائے گی تو اس وقت ہم مان لیں گے کہ ہاں تم نے سچ کہا تھا۔ تو کہا کہ آٰلْئٰنَ (10:51) اس وقت تمہیں یہ ماننا فائدہ کیا دے گا۔ پھر یہ سوال غلط ہے۔ جب اس کے بعد یہ مہلت کا وقفہ ہی نہیں رہے گا کتنی قوتِ مدافعت ڈاکٹر کیوں نہ بڑھا دے وہ مقابلہ ہی نہیں کر سکیں گے تخریبی Elements کا تو فائدہ کیا ہوگا اس وقت تمہارے ایمان لانے کا ڈاکٹر سے کہنے کا کہ ہاں صاحب ہم مانتے ہیں بہت اچھے طبیب ہو تم۔ اس وقت کچھ فائدہ ہی نہیں ہے۔ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۝۵۱ (10:51) پہلے اتنی جلدی مچاتے تھے اور جب ہلاکت سر پہ آجائے گی تو اس وقت پھر تم کہو گے کہ ہاں ہاں صاحب ہم ایمان لاتے ہیں تو فائدہ کیا ہے اس وقت۔ اس وقت سوچو سمجھو ابھی اس کے لیے مہلت ہے۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! قومیں سمجھتی نہیں ہیں' عجیب بات ہے پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے قوموں کو۔ ذرا باہر کھڑا ہوا آدمی دیکھ رہا ہوتا ہے کہ تباہی کی طرف چلے جا رہے ہیں لیکن یہ جو جا رہے ہوتے ہیں انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ (10:52) اس وقت تو پھر سوائے اس کے کہ یہ ان سے کہا جائے کہ نہیں بھئی یہ جواب تباہی آگئی ہے یہ تو اب ہمیشہ رہنے والی ہے۔ یعنی یہ تو اس وقت ٹل نہیں سکتی موت آگئی اس کا وقت آگیا۔ اور وہاں بھی یاد رکھئے یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے کچھ فیصلہ کر دیا تھا اور ہماری مرضی کے مطابق یہ ہوگا اور اب نہیں تم بچ سکتے۔ کہتا ہے نہیں۔ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۝۵۲ (10:52) یہ تو تمہارے اپنے ہی کیے کا نتیجہ ہے جو تمہارے سامنے آیا ہے ہم نے تو صرف قانون مقرر کیا تھا۔ آگے کہہ رہا ہے۔

بدعملی کے نتائج یقیناً مرتب ہو کر رہیں گے اور یہ کبھی ٹل نہیں سکتے:

وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ (10:53) اور جب یہ ان کے کہنے کے مطابق روز جو یہ کہتے ہیں تو تباہی اسی وقت نہیں آتی۔ تو تم سے پوچھتے ہیں کہ سچ مچ بتاؤ ایمانداری سے' یونہی مذاق کرتے ہو یا واقعی ٹھیک کہتے ہو تم۔ کہتا ہے یہ پوچھتے ہیں۔ وہ جو تمہیں اس سے پیشتر ہر معاملے میں صادق اور امین کہا کرتے تھے تم سے فیصلے کرانے آتے تھے تم جب ان کی تباہی کے متعلق یہ بات کہتے ہو کہ اس روش سے تباہ ہو جاؤ گے۔ تو کیفیت یہ ہے کہ یہی نہیں کہ خود غور و فکر سے اس پر توجہ نہیں دیتے سوچتے نہیں' بلکہ تم سے آ کے پوچھتے ہیں کہ بھئی ''سچو سچ دس'' کیا ٹھیک ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (10:53) ہاں اور میرا پروردگار شاہد ہے اس چیز کے اوپر کہ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (10:53) دیکھئے عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں۔ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (10:53) بالکل حقیقت ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اور میرا خدا اس پہ شاہد ہے میں اپنی طرف سے تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ اور ربی یہاں کہا ہے کہ جو کسی شے کو نقطۂ آغاز سے آخر تک بتدریج پہنچاتا ہے۔ تو یہ چیز تدریجاً ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا جو پروگرام ہے تدریجاً لے جانا والا وہ اس پہ شاہد ہے کہ یہ ہو کر رہے گا۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (10:53) یاد رکھو تم اس کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے۔ اس پہ بھی اپنی طرف سے یہ نہیں کہا ہے کہ تم یہ بار بار کہتے ہو چڑاتے ہو مجھ کو یہ پوچھتے ہو ''دیکھو ہُن میں کی کرنا ہیگا''۔ میں کیا کرتا ہوں تو بات ہی یہاں نہیں آتی' ایک قانون ہے جس کے مطابق یہ ہوگا اور تم اسے شکست نہیں دے سکتے۔

مدائن کے اندر ایران کی تباہی ایک حقیقت بن کر سامنے آ گئی تھی:

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ (10:54) اور پھر یاد رکھو کہ جب وہ فیصلہ کن گھڑی آ جاتی ہے تو پھر تم اگر ساری دنیا کے خزانے دے کر بھی چاہو کہ اس کے کفارے میں یہ دیدوں اور اس ہلاکت سے بچ جاؤں یہ نہیں ہو سکتا۔ تباہ ہونے والی قوموں کے خزانے بالکلیہ خالی تو نہیں ہوتے جس دن وہ تباہ ہوتے ہیں۔ جس دن ایران کی تباہی آئی تھی مدائن میں اس جماعت کے ہاتھوں میں' تو وہاں ایک مدائن کیپٹل سٹی کے اندر سے جو کچھ انہیں ملا تھا یہ عرب جیسی قوم بیچاری انہوں نے تو کہانیاں سنی ہوئی تھیں۔ یہ اپنی آنکھوں کے اوپر یقین نہیں کرتے تھے کہ دنیا میں اتنی دولت بھی کہیں ہوتی ہے۔ اور ایک ہی جگہ ابھی تو وہ تھی' مملکت پوری بھری پڑی تھی۔ شکست کھائی فوجوں نے' مملکت گئی فوجیں ختم ہوئیں اور سربراہِ مملکت کسریٰ کہ جس کا نام' تاریخ میں آج تک جس کی دھوم پڑی ہوئی ہے جان بچاتا ہوا مارا مارا پھرتا رہا عزیزانِ من! کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی اس کو' مختلف سلطنتوں میں گیا مختلف مملکتوں میں گیا پناہ لینے کے لیے' کہیں پناہ نہیں ملی۔ ایک پن چکی کے اندر مرا ہوا پایا گیا تھا۔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (10:53) تم اسے شکست نہیں دے سکتے۔ اس وقت اگر ساری دنیا کی دولت دے کر بھی چاہو کہ چھوٹ جائیں کفارے سے' اس سے وقت نہیں چھوٹ سکتے' تباہی مقدر ہوگی۔ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ (10:54) کفارہ ہی نہیں اس وقت کا Regret کیا ہوا ہے مجھے افسوس

ہے میں نے کیا یہ بھی کام نہیں دے سکتا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب آپ ہزار کہتے تھے کہ نہیں بھئی یہ چھوڑ دو اس چیز کو' اس سے موت آ جائے گی۔ میں نے یہ نہ چھوڑا' یہ کہنا بھی اس وقت کچھ کام نہیں دے گا۔

جب قانون فیصلہ دے دے تو پھر ندامت کا تصور چہ معنی:

ندامت وہ ہے نا کہ جس کے بعد انسان پلٹ آئے صحیح راستے کے طرف۔ پلٹ آنے کے لیے چلنے کی قوت چاہیئے' پھر اس موڑ پر آ کر پھر ٹھیک راستے پہ چلنے کے لیے وقت چاہیے۔ اور اگر یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں تو وہاں یہ احساس ہونا کہ غلط تھا یہ جو کچھ کیا' پھر تو کچھ کام نہیں دے سکتا۔ اسی لیے اس وقت جب تباہی آ جاتی ہے تو یہ ندامت اور یہ Regret بھی کسی کام نہیں آتا نہ کفارہ کسی کام آتا ہے نہ اس وقت یہ ندامت کسی کام آتی ہے۔ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (10:54) اس لیے کہ قانون نے فیصلہ دیدیا ہوتا ہے ان کے ہاں۔ بِالْقِسْطِ (10:54) پھر یہاں وہی آیا کہ فیصلہ قانون نے دیدیا ان کے ہاں۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (10:54) کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے ان کے خلاف۔ وہ جو خلافِ قانون ہوتا ہے وہ تو یہ ہے یہ جو آجکل اغوا کرتے پھر رہے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اردن والوں سے کہیے کہ ہمارا وہ قیدی چھوڑ دیں۔ سعودی عریبیہ والے جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں جن کا ان پہ ہاتھ ہی نہیں ان کے آدمی ہیں ان کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ تو وہ ان سے کہیں کہ ان کو چھوڑ دیں ورنہ ہم ان کو مار دیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اس عمل کے اندر کوئی ربط نہیں قانون کا۔

کائنات کی ایک ایک قوت انسانی اعمال کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب کرنے میں مصروف کار ہے:

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (10:54) دھاندلی نہیں وہاں۔ یہ کہ تم اسے شکست نہیں دے سکتے دلیل ہے اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (10:55) اس قوت کے زور کے اوپر تم اسے شکست دو گے' کائنات کی ساری قوتیں اس کے پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے روبہ عمل ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ برکارم

قرآن نے بھی دوسری جگہ کہا ہے یہ سارا سلسلۂ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہیں کہ کسی کا کوئی کام بلا نتیجہ یہاں نہ رہ جائے۔ یہ مکافاتِ عمل کا قانون یہ بنیادی قانون ہے یہ سارے باقی قوانین اس کے خدمت گذار ہیں اس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

خدا کے وعدہ سے مراد خدا کا قانون ہے اور ہمیشہ اٹل ہوتا ہے:

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (10:55) آگاہ کر دو ان کو اس بات سے کہ خدا کا ہر وعدہ حق ہوتا ہے۔ جسے وعدہ خدا کا کہا جا رہا ہے اُسے ہی ہم اپنی زبان میں قانون کہتے ہیں۔ قانون کا لفظ قرآن میں نہیں آیا عرب اسے ان الفاظ میں استعمال ہی نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ بھی عجیب قوم تھی ان کے ہاں بھی اس کے لیے وعدے کا لفظ ہوتا تھا کہ اس نے وعدہ کر لیا ہے اٹل ہے ایسا ہو کے رہے گا۔ بڑی عجیب چیز ہے عزیزانِ من! قوموں کے اندر جب یہ چیز پیدا ہو جائے بڑی خود اعتمادی ہوتی ہے

کہ وعدہ قانون کی حیثیت لے لے۔ اور قومیں جب بگڑتی ہیں تو وہاں قانون جوتی کی حیثیت نہیں رکھتا وعدہ تو ایکطرف رہا قانون کی حیثیت لے لے۔ قرآن نے اسی لیے خدا کے متعلق جہاں کہا ہے وعدے کے متعلق کہا ہے۔ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (13:31) وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ کتنی بڑی پابندی ہے جو خدا اپنے اوپر عائد کرتا ہے عزیزانِ من! ہم جو وعدہ کرتے ہیں ہم بھی اس کے خلاف نہیں کرتے۔ اب آپ سوچئے کہ لمبی چوڑی باتیں چھوڑ دیجیے عزیزانِ من! اور پروگرام تو' ایک اتنا سا پروگرام وعدے کا۔ قوم میں اتنی سی بات اگر پیدا ہو جائے وعدہ کرنے والا جو ہے اس کے اوپر اعتماد آپ کو یہ ہو کہ یہ وعدہ شکنی نہیں ہو گی قوم کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اتنے سے۔ یہاں Actually اتنے دھوکے نہیں ملتے جتنے کہ In-Security کی جو Sence ہے نا ہمارے ہاں' عدمِ اطمینان اور عدمِ اعتماد کا جو احساس پیدا ہو گیا اس کا نام ہے حزن اس کا نام ہے یہ پریشانیاں۔ تو کہا ہے تو اس نے بڑے یقین دلائے ہیں اس نے کہا ہے' او پھر تم کیوں مارے مارے؟ ''کچھ پتہ نئیں ہیگا اوہدا''۔ یہ ہے نا حزن' یہ ہے وہ چیز۔ ان کے عہدِ جاہلیت میں یہ چیز تھی کہ جب وہ کسی سے کہتے تھے کہ ہاں آ جاؤ میرے ہاں' میں پناہ دونگا۔

اپنے بیٹے کے قاتل کو پناہ دینے والے سے وعدہ خلافی نہیں کی:

اس پناہ دہی کے بعد یعنی کیفیت یہ تھی اس سردار کی' پناہ دی دینے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص تو میرے بیٹے کا قاتل تھا۔ اُسے کہا کہ اطمینان رکھو اس علم کے باوجود کہ تم میرے بیٹے کے قاتل تھے میرا وعدہ جو ہے وہ اسی طرح سے Stand کر رہا ہے۔ وہ باہر سے وہ جو دشمن تھے انہوں نے محاصرہ کیا ہوا تھا اس کے قلعہ کا' اس کا دوسرا بیٹا کہیں باہر سے آ گیا دشمن نے پکڑ لیا کہا کہ اسے ہمارے حوالے کرو ورنہ اس کو مار دیں گے۔ کہا اسے میں وعدہ دے چکا ہوں۔ جس نے ایک بیٹا مار دیا ہوا تھا اس کا قاتل ہے اپنے ہاتھ میں کہ اسے میں پناہ دے چکا ہوا ہوں' خود اس کے خلاف کچھ نہیں۔ دوسرا بیٹا ان کے ہاتھ میں ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں اسے پناہ دے چکا ہوں میں وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ سامنے بیٹا مروا دیا اس کی وعدہ خلافی نہیں کی۔ اور اس کے بعد اسے کہا کہ میں اپنی حدود سے اپنی حفاظت میں تمہیں باہر پہنچا تا ہوں۔ کہا کہ باہر پہنچنے کے بعد احتیاط برتنا اپنی حفاظت کر لینا میں انتقام لے کے چھوڑونگا تم سے۔ عزیزانِ من! جس قوم کی جاہلیت کے زمانے میں یہ کیفیت تھی وہ قوم تھی کہ جب وہ خدا پہ ایمان لائی اس نے کہا کہ ٹھیک ہے ہمارا خدا کہتا ہے کہ ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے' ہم اس کے نام کے اوپر اٹھنے والے کبھی وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ اور پہلی چیز قوم کے اندر باہمی اعتماد تھا جس نے سکون پیدا کر دیا تھا ہر ایک کے دل میں' دشمن کے متعلق بھی پتہ تھا کہ دشمن ہے۔ یعنی یہ چیز کہ اپنی حد سے تو تمہیں اپنی حفاظت سے باہر پہنچا دونگا۔ اور وہیں وارننگ دے رہا ہے کہ اس کے بعد محتاط رہنا۔ اس بیٹے کا نہیں وہ جو دشمن مار دیا ہے' وہ جو تم نے مار دیا تھا اس کا انتقام تم سے لے کے رہونگا اپنی حد سے باہر جا کر۔ یوں لوگ کہتے ہیں صاحب یہ چند سالوں میں اس قوم نے کر کیا دیا تھا۔ یہ ہوتی ہیں قوموں کی خصوصیات۔ ہر ایک کو یقین ہو کہ یہ ہے ان کے ہاں کا قانون۔ اور خدا نے جو کہا ہے وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) یہ ہے اعتماد کی بات کہ خدا بھی اپنی بات کے خلاف نہیں کرے گا خدا کے یہ بندے کیوں کریں گے میرے خلاف یہ بات۔ آج انفرادی سطح پہ تو یہ کیفیت ہے اجتماعی سطح کے اوپر قوموں کو باہمی معاہدے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا کہ کر تو آئے ہیں

پتہ نہیں اب وہ کیا کریں صاحب۔ چاٹتے رہیے معاہدے۔ روز معاہدوں کی جو مٹی پلید ہوتی ہے ہمارے سامنے ہے۔ پہلے تو ایک Language نئی ایجاد ہوئی ہے ابلیسی سیاست میں "Diplomatic Language"۔ بڑے بڑے ماہرِ فن ان کو بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں، کس کام کے لیے؟ ایسے الفاظ رکھے جائیں کہ اس وقت دستخط کرنے والا تو ان کے فریب میں آئے اور کل جو معنی ہم چاہیں وہ پہنا دیے جائیں۔ یہ جو ہوتا ہے نا کہ فیصلہ ہوگیا Drafting کررہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے ''انگریزی نئیں اوندی ایناں نوں؟ او ہندی اچ لکھ دیو'۔ وہ ڈرافٹنگ یہ ہورہا ہوتا ہے وہ جو لکھ کے کاٹے جاتے ہیں نا وہ یہ ہوتے ہیں کہ نہ اس کے تو یہ معنی یہی بنیں گے جب بھی لیے جائیں گے۔ جو بھی وہاں الفاظ میں پٹ گیا بس پٹ گیا۔ وعدہ خلافی ہوتی نہیں ہے اور نظر آجاتا ہے کہ صاحب کیا ہوگا۔ پہلی چیز تو یہ ہوتی ہے۔ بہرحال۔

قوموں کی موت وحیات کے سلسلہ میں خدا کے کئے وعدوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی:

تو کہا کہ یاد رکھو یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ان قانون کے مطابق هُوَ يُحْيِ وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾ (10:56) موت اور حیات کے فیصلے ہمارے اس قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ قانون کو واضح ہونا چاہیے قانون کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہر ایک تک وہ پہنچ جائے۔ کہا اس کے لیے۔ اور عزیزانِ من! یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ آج رمضان کا پہلا درس آرہا ہے اور وہ آیت ہمارے سامنے آرہی ہے جو ٹھیک اس تقریب کے عین مطابق تھی۔ یہ رمضان المبارک کیا ہے؟ یہ اس کے بعد آخری دن یہ ایک جشن آتا ہے یہ جشن کیا ہے؟ اب تو ہمیں اتنا ہی پتہ ہے نا کہ اردو میں اسے میٹھی عید کہتے ہیں ''اسی وی سیویاں دی عید کہہ دینے آں''۔ یا بہرحال چھوٹی عید۔ بس۔ پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے وہ کہتے ہیں عید ہے۔ ویسے عید کے تو معنی ہوتے ہیں ہر سال آنے والی چیز۔ یہ الگ بات ہے کہ عید جو آپ کے ہاں کی ہے وہ سال کے بعد آتی ہے ''ایہہ روزے یار ہیں مہینے ای آجاندے ہیگے''۔ ایک مہینہ پورا اس کے جشن کی تیاری کا عزیزانِ من! کتنا عجیب وہ تقریب عظیم ہوگی جس کی تیاری اس طرح سے ہورہی ہے۔ کیا ہے وہ تقریب؟ کیوں اس کی ایسی شاندار تیاری ہورہی ہے؟۔ یہی چیز ہے جو میں نے یہ کہا۔ کہا کہ واضح کردیا ہم نے کہ یہ قوموں کی موت اور حیات کے فیصلے قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ قانون یقیناً ایسا ہونا چاہیے کہ جو واضح طور پہ ہو اور قوموں کے سامنے آجائے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ (10:57) پوری نوعِ انسانی سے کہا گیا ہے عزیزانِ من!۔ اس دور میں بھی عالمگیر، قیامت تک الناس آئیں گے ان سب کے لیے یہ اعلان۔ اس لیے قرآن کے لیے کوئی پیریڈ یا وقفہ مقرر نہیں ہے کہ یہ آؤٹ آف ڈیٹ ہوجائے گا کلینڈر نہیں ہے کہ جو بدل جائے گا۔ قیامت تک کے لیے نبوت محمدیہ ﷺ جاری ہے۔

لفظ وعظ کا مفہوم ہلاکتوں سے روکنے کے ہیں یعنی قلب ونگاہ کی نفسیاتی بیماریوں کو شفا بخشنے کے ہیں

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ (10:57) تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ ہدایت آیا۔ مَّوْعِظَةٌ وعظ کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جو ہلاکتوں سے روکنے والی شے ہو۔ وہ یہ نہیں ہے کہ ''ساڈے ہر وعظ دے بعد اتھے سر پھٹول ہوندی رہندی ہیگی اے'' فساد ہوجاتا ہے۔ روکتی ہے تخریبی چیزوں کو۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وَشِفَاءٌ

لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (10:57) اس ٹکڑے کے اوپر آؤں تو عزیزانِ من! کتنے درس چاہئیں مجھے۔ شفا ہے دل کی بیماریوں کی۔ قرآن کی عظمت ہے۔ بمشکل بات سمجھ میں آتی تھی اس سے پیشتر۔ قرآن نے کہا تھا نا کہ جوں جوں علم ترقی کرتا چلا جائے گا اس کے حقائق سامنے آتے چلے جائیں گے۔ ہمارے اس دور میں عزیزانِ من! اگرچہ علم النفس کی اصطلاح ہمارے ہاں تھی پہلے بھی' اس پہ کوئی تحقیق ابھی نہیں ہوئی تھی۔ سائیکولوجی ایک سائنس کی حیثیت ہمارے دور میں آ کے بن رہی ہے۔ اس سے پیشتر جتنی تحقیقات تھیں قوموں کی زندگی اور موت کے متعلق' وہ خارجی عناصر جو تھے ان کے متعلق ہوتی تھی: معاشی پہلو اس کا کیا ہے؟ سیاسی پالیسی کس قسم کی ہے؟ Geographical Conditions کیا ہیں؟ آب و ہوا اس ملک کی کس قسم کی ہے؟۔ ان چیزوں کے متعلق فیصلے کیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ سیاسی پالیسیاں کیا ہیں۔ اس دور میں آ کے اس نئی سائنس نے جس کو سائیکولوجی کہتے ہیں اس نے آ کے کہا ہے کہ یہ جتنی چیزیں تم گنا رہے ہو یہ تو محض خارجی چیزیں ہیں ذرائع ہیں اصل چیز کچھ اور ہے۔ اصل شے جو ہے جس کے اوپر فرد یا قوم کی زندگی اور موت کا دارومدار ہے وہ اس کا Psyche ہے اس کا نفس ہے اس کا وہ قلب کہہ لیجیے۔ اس کے اندر ایک چیز ہے اس کی تبدیلی سے ہر تبدیلی باہر کی رونما ہوتی ہے۔

دلوں کا روگ ہی قوموں کے زوال کا باعث بنتا ہے:

اسے روگ لگ جاتا ہے تو قوموں میں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے' وہ مر جاتا ہے تو قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اسے تقویت رہتی ہے تقویت کے لیے توازن کا لفظ انہوں نے کہا' Balance جسے آپ کہتے ہیں۔ قرآن کا لفظ ہے یہ' اسی لیے اس نے میزان کہا ہے عزیزانِ من! توازن برقرار رکھنے والی شے۔ انہوں نے کہا ہے کہ توازن اس کا برقرار رہتا ہے فرد کی بھی زندگی قائم رہتی ہے سکون اور خوشگواریوں کی ہوتی ہے۔ قوموں کی زندگی بھی متوازن جب ہوتی ہے تو سکون و خوشگواریاں اور سرفرازیوں کی زندگی ہوتی ہے۔ فرد کا اگر توازن کھو جاتا ہے اعصابی بیماریوں کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے۔ قوم جب ان چیزوں کے اندر آ جاتی ہے تو اس کے اندر ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے افراد کے اندر یا مختلف گروہوں اور پارٹیوں کے اندر۔ یہ کشمکش نشانی ہوتی ہے اس چیز کی کہ Psyche جو ہے قوم کا اس کا Balance بگڑ گیا ہے۔ جب بھی چلتے ہوئے انسان کا ذرا سا توازن بگڑتا ہے تو لڑکھڑا جاتا ہے نا وہ۔ یہ جو قوموں کے اندر فساد برپا ہوتے ہیں معاشروں کے اندر وہ کہتے ہیں قوم کا Psychological Balance بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر تو انفرادی چیز تھی صرف' فرد کی سائیکولوجی ہوتی تھی۔ اب ان کے ہاں قوموں کو سائیکولوجی بھی ہے اس کے اوپر وہ چل رہے ہیں۔ اور یہ باقی جتنے بھی علوم اور سائنسز تھیں جنہوں نے اتنی اہمیت حاصل کی تھی۔ حتیٰ کہ اکنامکس کہ جسے ہمارے دور کے اندر اسے کہا ہی Age of Economics کہا جاتا ہے دورِ معاشیات۔ اتنی بڑی سائنس اتنی بڑی سیاست کھڑی ہوگئی اکنامکس کی بنیادوں کے اوپر' مارکس ازم کی بنیاد پہ۔ وہ کہا کہ قوموں کی موت و حیات کا معیار ہی اس کے اوپر ہے۔ انہوں نے سب کے پرخچے اڑا دیے کہنے لگے سب غلط ہے۔ یہ تو اندر ایک چیز ہے

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر ایک چیز کا بدلا

اسبابِ زوالِ انسانیت کے سلسلہ میں چودہ سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کی تشخیص اور اس کا علاج:

قرآن چودہ سو سال پہلے کہہ گیا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (13:11) کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی تاوقتیکہ اس کی Psyche کے اندر تبدیلی واقع نہ ہو۔ چودہ سو سال پیشتر عزیزانِ من! اعلان کر گیا ہے قرآن۔ کہا Psyche کا علاج ان چیزوں سے نہیں ہوگا بگڑا ہوا بیلنس اس طرح سے استوار نہیں ہوگا۔ وہ ان ہدایت کی رو سے ہوگا اس لیے اس کو کہا وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57) تمہاری نفسیاتی کشمکش جو ہے یہ اس کو دور کرنے والی چیز ہے۔ یہ ہے قرآن عزیزانِ من! چودہ سال پیشتر۔ میں نے عرض کیا ہے ابھی پچاس سال پہلے بھی یہ چیز ہے۔ یہ ہے قرآن عزیزانِ من! چودہ سال پیشتر۔ میں نے عرض کیا ہے ابھی پچاس سال پہلے بھی یہ چیز نہیں دیجاتی تھی۔ ھُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ (10:56) سے بات شروع کر رہا ہے۔ قوموں کی موت وحیات کا ذکر چلا آ رہا ہے۔

خدائے علیم نے ایک فرد سے لے کر پوری انسانیت تک امراض قلب

کا علاج قرآنِ حکیم ہمیشہ کے لئے پیش کر دیا ہے

قوموں کی موت وحیات کے فیصلے کس چیز سے ہوتے ہیں؟ یہ سینے کے امراض سے ہوتے ہیں۔ لفظ تو یہی ہے نا جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' Psyche بگڑتا ہے توازن بگڑتا ہے۔ اس کا علاج کرتا ہے۔ فرد کا بھی وہ کرتا ہے جماعت کا بھی کرتا ہے قوم کا کرتا ہے عالمگیر انسانیت کا کرتا ہے اسی لیے یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ کہا ہے صاحب۔ ابھی تک سائیکولوجی قوموں تک انہوں نے پہنچائی ہے' وہ پوری نوعِ انسانی کی سائیکولوجی کے لیے کہتا ہے وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57) انسانیت کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار رکھنے والا۔ وَھُدًی وَّرَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (10:57) کہا اس کے اندر یہ سب کچھ ہے۔ لیکن اس شفا کی طرف لے جانے والا راستہ اس کی راہنمائی' پھر وہ سامان۔ اور سامان بھی یہاں عزیزانِ من! طبعی زندگی کے لیے جس سامان کی ضرورت ہے رزق نہیں یہاں کہا رحمت کہا ہے۔ رحمت اس لطافت والے سامان کو کہتے ہیں جو لطیف چیزوں کی نشوونما کرتا ہے۔ Psyche جیسی لطیف چیز جو ہے اس کے علاج کے لیے جو سامان دیتا ہے اسے رحمت کہہ کے پکارتا ہے۔ (وَھُدًی وَّرَحۡمَۃٌ) (10:57) (یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ) (10:57) سے خطاب ہے۔

قرآنِ حکیم اپنے فلسفۂ حیات کو عقیدت کی۔۔۔ بجائے عقل وبصیرت

اور دلیل وبراہین کی بنا پر پیش کرتا اور منواتا ہے

لیکن کہا کہ بہرحال اس سے فائدہ تو وہی اٹھا سکیں گے نا جو اس کی صداقت پہ یقین رکھیں گے۔ پہلی چیز تو Psyche کی تبدیلی میں یہ ضروری ہوتی ہے۔ اس کی صداقت پر یقین بھی وہ اندھی عقیدت کی رو سے نہیں منواتا کہ پہلے یہ چیز کر کے آؤ عقیدت کی بناء پہ پھر اس کی طرف آؤ۔ کہتا ہے بالکل نہیں۔ عقل وبصیرت کی رو سے علم وتدبر کی رو سے اسے چھان پھٹک لو۔ تم جب اس

یقین پہ پہنچ جاؤ کہ واقعی اس کے اندر میرے لیے شفاء ہے پھر آؤ اور اس کے بعد دیکھو یہ کیسے شفاء دیتا ہے۔عزیزانِ من ! علاج کی کامیابی کے لیے اولیں شرط یہ ہے کہ آپ کو ڈاکٹر یا طبیب کے اوپر اعتماد ہو۔ اور سائیکولوجی میں تو بات ہی اور ہے۔ Psycho Analysis جو ہوتا ہے تجزیۂ نفس جو یہ کرتے ہیں۔اب تو سائیکوتھراپی آ گئی ہے وہ علاج کرتے ہیں ان امراض کا ۔لیکن Psyco Analysis والا ہو یا اس کی یہ شکل جس کو ہپناٹزم کی آپ کہتے ہیں یہ سائیکولوجی کی ایک قسم ہے۔ یہ صرف ان کا ہوسکتا ہے جو صرف اس عقیدت کے ساتھ آئیں اس شخص کے پاس کہ ہمیں یقین ہے تمہارے اوپر۔ جو شخص بھی اس یقین کو ساتھ لے کے نہ آئے آپ حیران ہونگے Psycho Analysis تو بڑی تھوڑی سی چیز ہے ہپناٹزم میں بڑی قوت ہوتی ہے۔

پیر اسی وقت تک پیر کہلواتا ہے کہ جس وقت تک آپ اسے پیر تصور کریں:

یہ اس شخص کے اوپر ہپناٹزم قطعاً اثر نہیں کرتی جو یہ یقین لے کے آئے پتہ نہیں یہ ٹھیک کرے نہ کرے' مجھے عقیدت نہیں ہے اس کے اوپر' چلو میں دیکھ لیتا ہوں۔ بالکل کچھ نہیں ہوتا۔ بنیادی چیز یہ ہے وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ (10:57) کے لیے کہ اس کی صداقت پہ ایمان ہونا چاہیے۔اندھا ایمان نہیں۔پہلی چیز یہ ہے۔ یہ جتنی آپ کے ہاں کی درگاہوں کی اور جتنی بھی یہ بڑی بڑی بارگاہیں ہیں ان کے ہاں سے جو اس قسم کے کچھ آپ اولادیں لے کے چلے آتے ہیں اور مرادیں لے کے چلے آتے ہیں۔ وہاں کچھ نہیں ہوتا عزیزانِ من ! یہ آپ کی اپنی عقیدت ہے جو وہاں لے کے جاتی ہے۔ اور پھر آپ کو یاد ہے جو میں دہرایا کرتا ہوں اور جسے کہا کرتا ہوں پلے باندھ لو وہ پنجابی کا ''تت کڈیا ہو یا جیہڑا'' یہ ہے ساری چیز جو اس نے چار لفظوں میں اس پنجابی محاورے نے ''تت کڈ دتا' پیر مندیاں نوں کھانداا ے''۔ پیر کو ماننا چھوڑ دیجیے ''پیر ای نئیں رہندا بندے دا پتر بن جانداا ے فیر'۔ ''پیر مندیاں نوں کھانداا ے''۔ بڑی عجیب چیز تھی جو کہہ گیا ہے۔ بات یہی ہے جو اس نے کہا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ تمہیں جو پیر کی عقیدت کے اوپر ایمان لانے کے لیے کہا جاتا ہے تو اوہام پرستی کی بناء پہ کہا جاتا ہے یہ کر دیتے ہیں وہ کر دیتے ہیں۔تمہاری فکری قوتوں کے سوچ کو آف کیا جاتا ہے عقیدت پیدا کی جاتی ہے۔ بڑی سطحی عقیدت یہ ہوتی ہے عزیزانِ من ! قرآن کے الفاظ میں ایسا پودا جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہی ہوں۔ یہ جو یقین ہوتا ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں قرآن کہتا ہے یہ وہ یقین ہے جو علم و بصیرت کی بنیاد کے اوپر یقین آپ کو آتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی قوت اس میں کسی قسم کی بھی لغزش نہیں پیدا کر سکتی۔

تو ہم پرستی ہمیشہ کم علمی اور جہالت کی پیداوار ہوتی ہے:

تو ہم پرستی کی عقیدت کی عمر کیا ہوتی ہے عزیزانِ من ! آپ کی ایک مراد پوری نہ ہو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

قندیل آسمانی کی شکل میں فکرِ انسانی کو جلا بخشنے والا

ایک ایسا تحفہ جو دنیا بھر کی دولت سے زیادہ قیمتی ہے

وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (10:57) کہا اے نوعِ انسانی ! سوچو تو سہی کہ اس قسم کا اگر نسخہ کسی کو مل جائے اور

کیفیت پھر یہ ہو اس نسخے کی کہ ساری دنیا کے سیانے سمجھدار فکر والے جمع ہو جائیں۔ پہلے تھا نا چیلنج کہ اس کی مثل ایک سورۃ دس آیتیں بھی تم بنا نہیں سکتے کہ فکرِ انسانی کبھی اس قسم کا ضابطہ نہ دے سکے۔ ملے پھر کس طرح سے کہ انسان تو دے نہیں سکتا؟ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ (10:58) یہ صرف اس کے فضل اور رحمت سے ہے یہ کہ اتنی بڑی گراں بہار چیز تمہیں مل رہی ہے۔ کہا تم محسوس نہیں کر رہے کہ یہ کتنی بڑی قیمتی شے ہے اتنی بڑی هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (10:58) ساری دنیا کی دولت بھی اکٹھی کر لو اس سے بھی زیادہ قیمتی اور بہتر شے ہے۔ ملی اور ملی یوں مفت قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ (10:58)۔ کہا سوچو تو سہی کہ اس قسم کی وہ چیز ہو وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (10:57) موت اور حیات کا دار و مدار جس کے اوپر ہو ایک پیسہ خرچ نہ کر و تم اس کو حاصل کرنے کے لیے۔ ایک صدری نسخہ حاصل کرنے کے لیے۔

خدائے علیم نے ماہ رمضان میں انسانیت کے شب و روز کی خاطر صراطِ مستقیم کی وضاحت کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات عطا کر دیا:

عزیزانِ من! کسی طبیبوں کے خاندان کا پوچھو نہیں کتنا کچھ دینے کے لیے انسان تیار ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے پوری کی پوری؟؟ تمہیں مل رہی ہے یہاں۔ ایک پیسہ خرچ نہیں کیا الناس! تم نے۔ کہیں سے مل نہیں سکتی تھی فکرِ انسانی عاجز تھا۔ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ (10:58) کہا بتاؤ بیمار کو اگر اس قسم کا نسخہ مل جائے اور مل جائے مفت' کیا یہ تقریب ایسی نہیں ہے کہ اس کے اوپر وہ جشنِ مسرت منائے۔ فَلْيَفْرَحُوْا (10:58) او جشنِ مسرت مناؤ اس کے ملنے کے اوپر۔ یہ ہے عید عزیزانِ من! کسی اور تقریب کے متعلق قرآن نے یہ نہیں کہا۔ یہ رمضان ہے کیا؟ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) ایک ہی خصوصیت ہے اس رمضان کی جو بتائی۔ او بابا رمضان پوچھتو ہو کہ یہ کیا ہے رمضان؟ او بھئی اس میں قرآن نازل ہوا۔ آہاہاہا۔ دو لفظوں میں بات کہہ گیا 'اواس میں قرآن نازل ہوا'۔ بھئی قرآن نازل ہوا وہ کیا ہے؟ کہا قرآن: وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ... مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ... وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ (10:57) هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (10:58) اور وہ یہ قرآن شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) یہ ہے رمضان جس میں قرآن نازل ہوا اس میں یہ پروگرام دیا۔

اس متاعِ حیات مل جانے پر جشن منانے کا حکم:

پروگرام کی بات تو پھر اور کرونگا۔ کہا کہو ہے اس قابل کہ نہیں کہ اس کا جشن منایا جائے۔ فَلْيَفْرَحُوْا (10:58) دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے عزیزانِ من! تہوار منانے کے ان کے ہاں دیکھئے تقاریب کیا ہوتی ہیں۔ آرین قوم ہمارے ہاں زراعت پیشہ قوم تھی موسموں کی تبدیلی کے اوپر ان کے ہاں تہوار آتے تھے ہولی آتی تھی اور لوری آتی تھی اور بسنت آتی تھی اور یہ آتے تھے۔ کسی بڑے انسان کی موت یا اس کی پیدائش کے تہوار کہیں آتے تھے' کوئی بڑا واقعہ کہیں کوئی لڑائی فتح ہوئی تھی اس کی تقریب میں کوئی تہوار آتا تھا۔ بڑی وقتی اور ہنگامی چیزیں تھیں۔ یہ قوم جب آئی ہے دنیا میں جیسے ہم

جماعتِ مؤمنین کہتے ہیں ان کے ذمہ تو کائنات کے گیسوؤں کو سنوارنے کا اتنا عظیم فریضہ دیا گیا تھا انہیں فرصت کہاں تھی کہ یہ تہوار مناتے۔ اتنا بڑا پروگرام ان کے لیے تھا لیکن اس کے باوجود تہوار جشن وتقریب کی ضرورت تو ہوتی ہے انسان کے لطیف جذبات کی تسکین بھی بڑی ضروری ہے۔ اس کی زندگی کی گاڑی خالی پٹرول سے نہیں چلتی موبل آئل اس میں ہونا چاہیے۔ لیکن قرآن نے اگر کوئی ایک تقریب کے لیے کہا ہے تو وہ یہ نہیں' نہ موسموں کی تبدیلی نہ مشاہیر میں کسی کا جنم یا موت کا دن نہ کوئی بڑی لڑائی کا فتح کرنے کی یادگار' کچھ نہیں۔ ایک ایسا نسخہ ملنے کی تقریب کہ جو وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ (10:57) زندگی بخشنے والا جو ہے۔ او مرنے والے تیری زندگی کے سامان لے کے میں آ گیا۔ کہو کہ یہ مرنے والا جس کو زندگی مل جائے گی باقی عمر میں اس دن منائے گا یا نہیں یہ تقریب؟ فَلْيَفْرَحُوْا (10:58) جشنِ مسرت مناؤ اس کے اوپر۔

جشنِ نزولِ قرآن کے لئے ایک ماہ کی تیاری کا پروگرام:

یہ ایک ہی حکم ہے جشن منانے کا۔ یہ ہے عزیزانِ من! جسے عید کہا جاتا ہے اور یہ ہے جو اس کی تیاریوں کا مہینہ ہے۔ اتنا بڑا جشن اس کی تیاریوں کے لیے خاصا وقت چاہیے تھا۔ لیکن جیسا جشن عام دنیا کے جشنوں سے نرالا یعنی اس کی تقریب' اسی طرح سے اس کے منانے کی تیاریوں کا پروگرام بھی دنیا سے انوکھا۔ کامل تطہیرِ فکر ونظر' قوم میں صحیح Discipline پیدا کرنے کا پروگرام' جذبۂ جہاد کے لیے ایک Refresher Course ۔ وہ Reservest سال کے بعد ایک مہینے میں جاتے ہیں ٹریننگ کی مشق کرنے کے لیے۔ یہ بھوک اور پیاس کیا ہے؟ جنگ میں جانے والے سپاہی کے لیے ایک خوگر بنانے کی بات ہے نا۔ پوری قوم کو اس کے لیے مجاہد تیار کرنا تھا۔ تیاریاں اس انداز سے ہو رہی ہیں۔ پھر یہ جو چیز ہے پتہ نہیں بعد میں کب یہ آئی ہے یہ جو سارے کا سارا قرآن دہرانا ہے۔ اب تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قرآن بھی یہ ثواب کے لیے روزہ بھی ثواب کے لیے وہ رات کی تراویحاں بھی ثواب کے لیے اس کے اندر قرآن کا دہرانا بھی ثواب کے لیے۔ ایک موہوم عقیدت۔ ورنہ یہ بھی میں کہہ رہا ہوں کہ جنہوں نے بھی یہ چیز ایجاد کی ہے مجھے اس سے غرض نہیں کہ کب یہ شروع ہوئی ہے نبی اکرم ﷺ نے شروع کیا یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں ہوئی۔ بات تو یہ تھی کہ یہ پورا قرآن جو تھا وہ سارے کا سارا سامنے لایا جاتا۔ یوں تو سارا سال ان کے سامنے یہ ہوتا تھا۔ ابھی کل کی بات عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ ہمارا تو بچپن ابھی اس ماحول میں گذرا ہے جب بھی جاگ کھلی گھر کے اندر سے وہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھنانے کی طرح قرآن کی آوازیں۔ جب بھی گھر میں آنکھ کھلی قرآن کے گنگنانے کی آوازیں کان میں پڑتی تھیں۔ لیکن وہ قرآن تو جو انہوں نے گنگنایا تھا اس میں تو ایک تو زبان ان کی تھی پھر وہ تو اس کو سمجھتے تھے سال بھر اس کی تلاوت ہوتی تھی ہر ایک کے ہاتھ میں یہ ہوتا تھا ہر جگہ اپنے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

ماؤزے تنگ کی کتاب سے اہلِ چین کا سلوک:

آج ہم عش عش کرتے ہیں کہ صاحب وہ لال کتاب جو ہے ماؤزے تنگ کی دیکھئے ہر چینی کی بغل میں ہوتی ہے۔ جب کوئی

مسئلہ آتا ہے پرابلم آتی ہے یہ ہے وہ چیز۔ وہ قوم زندہ رہے گی جب تک اگر اس قانون کے اندران میں ہے جان ایسی کہ جب کوئی پرابلم آتی ہے وہ بیٹھ جاتے ہیں اس پہ۔ یہ اس لیے ہر ایک کے پاس ہر جگہ ہوتا تھا کہ جب کوئی پرابلم آئے اس کو کھول کو دیکھے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ (ھدًی) زندگی کے ہر دوراہے کے اوپر بتائے گا کدھر جانا چاہیے تمہیں سال بھر یہ۔ ایک مہینہ تیاری کا اس میں یہ سارے کا سارا پورے کا پورا کورس سامنے دہرا دیا گیا صاحب یہ۔ فکر ونظر کی تطہیر' جسم وجان کے اندر وہ توانائیاں جو مجاہد کو ایک سپاہی کو چاہئیں' مہینہ بھر کے لیے یہ کورس Revise کر دیا گیا۔ اور اس طرح سے نئے سرے سے اس قوم کو تیار کر کے اور وہاں بٹھا دیا گیا' کاہے کے لیے؟ ٹھیک ہے اس کے ملنے کے اوپر سجدۂ شکر بھی بجالاؤ اور پھر باہمی مشاورت سے نمائندے تیار کرو اس عظیم اجتماع کے لیے جو ڈھائی ماہ کے بعد وہاں مکہ میں ہونے والا ہے تمہارا' اس مرکز میں بھیجنے کے لیے انتخاب کرو۔ یہ انتخاب تھا عزیزانِ من! جو اس پروگرام کے بعد ہوتا تھا۔ اس طرح سے تطہیر فکر ونظر لیے ہوئے قوم کا انتخاب جو ہوتا تھا آپ سوچ سکتے ہیں کیا انتخاب وہ نہیں ہوگا۔ وہ اجتماع جو تھا یہ تھا عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جو اقبالؒ کہہ گیا ہے کہ

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں

دو لفظ یہ کہہ جاتا ہے صاحب کیا بات ہے!!! عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں۔ ہر عید کے بعد ان کی مملکت میں ان کے دین کے نظام میں تازہ شکوہ پیدا ہوتا تھا۔

عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنین

علامہ اقبال آج کی عید کو تو ہجومِ مؤمنین کے نام سے پکارتا ہے:

یہاں مؤمنین کا لفظ بھی عجیب لایا ہے یہ شخص' ہجومِ مومن۔ اب تو وہ ہجوم بھی نہیں رہتا ہے۔ اس بچپن کے ہجوم میں بھی ایک طبعی خوشی تو ہوتی تھی۔ ہم بچوں کو نئے کپڑے ملتے تھے نیا جوتا ملتا تھا۔ اس دن اتنے پیسے ملتے تھے کہ شام کو جن کا حساب نہیں دینا پڑتا تھا کہ کہاں خرچ کیے۔ ورنہ روز کے پیسے کا تو بتانا پڑتا تھا'' کی لیا سی پیسے دا''۔ بغیر حساب رزق ملتا تھا اس دن عزیزانِ من! عیدگاہ میں جاتے تھے تو کم از کم ایک دن تو دیکھتے تھے کہ قوم میں ہر ایک کو نئے کپڑے پہنے ہوئے دیکھتے تھے کوئی پھٹے کپڑے والا نہیں ہوتا تھا کوئی پرانے کپڑے والا وہاں نہیں ہوتا تھا۔ اتنی خوشی ہوتی تھی' ہر گھر میں سویاں پکتی تھیں' ہر گھر سے خوشی کی آواز آتی تھی گئے گذرے دور میں بھی عزیزانِ من!۔ اب اس ہجومِ مؤمنین کو عید کے دن جا کے دیکھ لیجیے گا اسی نوے فیصد تو وہ ہوتا ہے جن کو نیا کپڑا ابھی اس دن نصیب نہیں ہوتا۔ اور اب تو شاید پرانے بھی باقی نہ رہے ہوں۔ ہجومِ مؤمنین میں بھی ہم یہاں آ گئے۔ اور عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں۔ عزیزانِ من! یہ تھا یہ تیاری کا مہینہ رمضان کا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ یہ پہلے ہی درس میں یہ آیت سامنے آ گئی اور یہ ہے جس کو آپ عید کہتے ہیں۔ سورۃ یونس کی آیت 58 تک ہم آ گئے 59 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

خورشید انور (چیئرمین ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوجوان اور نظامِ تعلیم کی از سرِ نو تشکیل
قرآنی بصیرت سے قومی احیاء تک

قوموں کی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ کسی بھی معاشرے کا مستقبل اس کی ابھرتی ہوئی نسل کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ آج کے نوجوان دراصل کل کی ریاست، تہذیب اور انسانی اقدار کے معمار ہوتے ہیں۔ اگر نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح بنیادوں پر استوار ہو تو قوم کی فکری، اخلاقی اور تمدنی سمت خود بخود درست ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر تعلیم اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائے تو وہ ترقی کے بجائے انحطاط کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل تھا جو قرآنِ کریم کی رہنمائی میں انسانی زندگی کے اعلیٰ اصولوں کو عملی صورت دے۔ افسوس کہ قیامِ پاکستان کے بعد سب سے اہم ذمہ داری، یعنی نئی نسل کی تعلیم کو اس نظریاتی بنیاد پر استوار کرنا، مسلسل نظر انداز ہوتی رہی۔ یہی مجرمانہ تغافل آج قومی انتشار، فکری الجھن، اخلاقی کمزوری اور معاشرتی بے سمتی کی صورت میں ہمارے سامنے کھڑا ہے۔

قومی بحران کی اصل جڑ:

ہم اکثر نوجوانوں کی بے راہ روی، اخلاقی زوال اور فکری انتشار پر افسوس کرتے ہیں، مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ نوجوان تیار کہاں ہوتے ہیں؟ یہی درسگاہیں، یہی تعلیمی ادارے اور یہی نصاب ان کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب تعلیم کا مقصد محض روزگار حاصل کرنا رہ جائے اور کردار سازی اس سے خارج ہو جائے تو نتیجہ ایک ایسی نسل کی صورت میں سامنے آتا ہے جو علم تو رکھتی ہے مگر سمت سے محروم ہوتی ہے۔

اصل بحران نوجوان نہیں، بلکہ نظامِ تعلیم ہے۔

تعلیم نے انسان بنانے کے بجائے محض پیشہ ور افراد پیدا کرنا شروع کر دیا ہے۔ علم اور اقدار کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے، عقل اور وحی کی ہم آہنگی ختم ہو گئی ہے، اور تعلیم روح سے خالی معلومات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔

دین و دنیا کی مصنوعی تقسیم

اسلامی تصورِ تعلیم کی سب سے بڑی خصوصیت وحدتِ علم ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا دو الگ دائروں کے نام نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ:

دینی تعلیم الگ اداروں میں محدود کر دی گئی، جبکہ جدید علوم کو مذہب سے لاتعلق سمجھ لیا گیا۔ یہ تقسیم اسلامی فکر کے سراسر خلاف ہے۔ اسلامی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ طالب علم صرف مذہبی معلومات حاصل کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ طبیعیات، معاشیات، سیاست، تاریخ یا فلسفہ، جس علم کا بھی مطالعہ کرے، اس قابل ہو جائے کہ زندگی کے ہر مسئلے کو قرآنی بصیرت کی روشنی میں سمجھ سکے۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا:

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

یعنی دین کی چابی سے دنیا کے مسائل کو حل کرنا۔

تعلیم کا قرآنی تصور

قرآنِ کریم انسان کو اندھی تقلید نہیں بلکہ شعور، تدبر اور عقل کے استعمال کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن بار بار انسان کو غور و فکر، تحقیق اور فہم کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے نزدیک:

- عقل بغیر وحی کے بھٹک سکتی ہے،
- اور جذبات عقل کو غلام بنا سکتے ہیں،

لیکن وحی کی روشنی میں استعمال ہونے والی عقل انسان کو ارتقاء کی بلند منزلوں تک پہنچاتی ہے۔

اس لئے تعلیم کا اصل مقصد ہونا چاہیے:

- عقل کی تربیت،
- کردار کی تعمیر،
- اجتماعی ذمہ داری کا شعور،
- انسانیت کی خدمت کا جذبہ۔

نظامِ تعلیم کی از سرِ نو تشکیل

پاکستان میں تعلیمی اصلاحات محض نصاب کی تبدیلی سے ممکن نہیں؛ اس کے لئے مکمل فکری انقلاب درکار ہے۔

1۔ابتدائی تعلیم کی بنیاد

ابتدائی تعلیم بچوں کی شخصیت کی تشکیل کا دور ہے۔ اس مرحلے پر:

- تعلیم تربیت کے ساتھ مربوط ہو،
- تجربہ کار، باوقار اور بالغ خواتین کو بطور استانی مقرر کیا جائے،
- خصوصاً دیہی علاقوں میں مقامی خواتین کو ترجیح دی جائے،
- استاد صرف معلّم نہ ہو بلکہ مربّی بھی ہو۔

2۔قرآن مرکزِ تعلیم

قرآن کی تعلیم کسی ایک مضمون تک محدود نہ رہے بلکہ:

۞ ابتدا سے اعلیٰ تعلیم تک مسلسل جاری رہے، ۞ عربی زبان کی تعلیم لازمی ہو،

۞ ہر علم کو قرآنی مقصدِ حیات کے ساتھ مربوط کیا جائے۔

طالب علم یہ سمجھ سکے کہ علم کا مقصد فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انسانی فلاح کے لئے استعمال کرنا ہے۔

3۔جدید علوم اور اسلامی فکر کا امتزاج

نیا تعلیمی نظام یہ شعور پیدا کرے کہ:

۞ سائنس اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو سمجھنے کا ذریعہ ہے، ۞ معاشیات انسانی عدل کے قیام کا وسیلہ ہے،

۞ سیاست اجتماعی امانت ہے، اور علم کا ہر شعبہ انسانی خدمت کے لئے ہے۔

4۔زبان کا متوازن نظام

تعلیم کے ذرائع میں حکمت ضروری ہے:

۞ ابتدائی تعلیم مقامی زبان میں، ۞ ثانوی سطح پر اردو،

۞ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی بطور بین الاقوامی علمی زبان۔

انگریزی سے گریز دراصل دنیا سے علمی انقطاع کے مترادف ہوگا، جبکہ قومی زبان فکری شناخت کی محافظ رہے گی۔

5۔طبقاتی نظامِ تعلیم کا خاتمہ

موجودہ تعلیمی بحران کی ایک بڑی وجہ طبقاتی تقسیم ہے:

۞ امیروں کے الگ ادارے، ۞ غریبوں کے الگ تعلیمی معیار، ۞ نجی تعلیم کا کاروبار بن جانا۔

ریاست کو تعلیم کی مکمل ذمہ داری قبول کرنی ہوگی کیونکہ قوم کے بچے دراصل ریاست کی اجتماعی اولاد ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیوں کا حقیقی کردار

جامعات محض ڈگری فیکٹریاں نہ ہوں بلکہ:

۞ قرآنی فکر کا گہرا مطالعہ، ۞ اسلامی تاریخ کا تنقیدی جائزہ، ۞ عالمی مسائل کا قرآنی حل،

۞ فکری قیادت کی تیاری، ۞ ان کا بنیادی مقصد ہو۔

ایسے فارغ التحصیل نوجوان پیدا ہوں جو عالمی سطح پر انسانیت کے مسائل پر قرآنی نقطۂ نظر پیش کر سکیں۔

تربیت: تعلیم کا گمشدہ جز

آج تعلیم میں معلومات موجود ہیں مگر تربیت غائب ہے۔ امتحانی نظام نقل، سفارش اور نمبروں کی دوڑ بن چکا ہے۔ جب تک تعلیم کا مقصد کردار سازی نہیں بنتا، قوم کی اخلاقی تعمیر ممکن نہیں۔

حقیقی تعلیم وہ ہے جو:

❁ دیانت پیدا کرے، ❁ ذمہ داری کا احساس دے،

❁ اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا سکھائے۔

ریاست اور معاشرے کی مشترکہ ذمہ داری

والدین معاشی جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں؛ اس لئے تعلیم کی بنیادی ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے۔ ایک اسلامی مملکت کا فرض ہے کہ:

❁ تعلیم مفت اور معیاری ہو، ❁ تربیت ہمہ گیر ہو،

❁ اور نوجوان قومی نظریہ کے شعوری امین بن کر ابھریں۔

مطلوبہ نسل کی خصوصیات

❁ مطلوبہ تعلیمی نظام سے جو نسل پیدا ہوگی وہ:

❁ علم اور ایمان کی ہم آہنگی رکھے گی،

❁ عقل اور وحی کے امتزاج سے سوچے گی،

❁ کردار میں پاکیزہ، ❁ فکر میں آزاد،

❁ اور انسانیت کی خدمت میں پیش پیش ہوگی۔

❁ ایسی نسل ہی پاکستان کے حقیقی مقصد کو زندہ کرسکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ

آج دنیا سیاسی کشمکش، معاشی عدم توازن اور اخلاقی بحران کا شکار ہے۔ انسانی عقل تنہا ان مسائل کا پائیدار حل پیش کرنے میں ناکام دکھائی دیتی ہے۔ قرآنِ کریم انسان کو وہ مستقل اقدار عطا کرتا ہے جو زمانے کی تبدیلیوں سے ماوراء ہیں۔

لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ ہم نوجوانوں کی تعلیم کو محض معلوماتی نظام سے نکال کر قرآنی بصیرت پر مبنی انسان سازی کے عمل میں تبدیل کریں۔ یہی قومی بقا، فکری آزادی اور عالمی امن کی واحد راہ ہے۔

علامہ اقبال کی دعا آج بھی ہمارے لئے رہنمائی ہے:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

❁❁❁❁

اقبال ادریس، منگورہ سوات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ پرویز اور حج کا عالمی اجتماع

برصغیر کی فکری تاریخ میں بعض شخصیات ایسی گزری ہیں جنہوں نے دین کے روایتی تصورات پر نئے زاویوں سے غور کرنے کی دعوت دی۔ ان میں غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے دینِ اسلام کو محض چند رسوم اور عبادات تک محدود سمجھنے کے بجائے اسے ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا، جس کی بنیاد قرآنِ کریم کی براہِ راست رہنمائی پر قائم ہے۔

پرویز صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین کے ہر رکن کو محض ایک عبادتی عمل کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اس کے اجتماعی اور عملی اثرات پر بھی توجہ دلاتے ہیں۔ اسی تناظر میں انہوں نے حج کو بھی ایک وسیع تر معنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ عام طور پر حج کو ایک انفرادی عبادت کے طور پر دیکھا جاتا ہے، مگر ان کے نزدیک اس کی اصل اہمیت امت کے اجتماعی شعور سے وابستہ ہے۔

حج: ایک مرکزی اجتماع کی حقیقت

قرآنِ کریم میں کعبہ کے بارے میں ارشاد ہے کہ اسے "قیاماً للناس" قرار دیا گیا ہے۔ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ اس تعبیر کو محض ایک مذہبی اصطلاح نہیں سمجھتے بلکہ اس کے اندر ایک اجتماعی مفہوم تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کعبہ دراصل انسانوں کے قیام اور استحکام کا مرکز ہے، اور حج کا سالانہ اجتماع اسی مرکزیت کا عملی اظہار ہے۔

انہوں نے اس خیال کو مختلف مواقع پر اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں سے مسلمانوں کا ایک ہی مقام پر جمع ہونا ایک غیر معمولی موقع فراہم کرتا ہے۔ اگر اس اجتماع کو صرف عبادات تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فکری اور اجتماعی تبادلۂ خیال بھی کیا جائے تو امت کی اجتماعی زندگی میں ایک نئی روح پیدا ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ان کے بعض خیالات ان کے خطوط اور مضامین میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ مثلاً ''سلیم کے نام خطوط'' میں وہ ایک مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی احکام کا مقصد افراد کو ایک ایسے نظام کے ساتھ

وابستہ کرنا ہے جس میں باہمی تعاون اور اجتماعی شعور کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ ان کے نزدیک حج اسی شعور کی تربیت کا ایک عملی ذریعہ بن سکتا ہے۔

عبادات کا مقصد اور ان کی روح

غلام احمد پرویز کی فکر کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ عبادات کو محض رسمی اعمال کے طور پر نہیں دیکھتے۔ ان کے نزدیک ہر عبادت کے پیچھے ایک عملی مقصد اور ایک اخلاقی پیغام موجود ہوتا ہے۔ احرام کی سادگی، طواف کی مرکزیت اور رمیِ جمرات جیسے اعمال کو وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔

انہوں نے اپنی کتاب ''قرآنی فیصلے'' میں عبادات کے مقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآنِ کریم انسان کو محض رسمی عبادات کی طرف نہیں بلکہ ایک متوازن اور بامقصد زندگی کی طرف رہنمائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک دین کا اصل مقصد انسانی شخصیت کی تعمیر اور معاشرے کی اصلاح ہے، اور عبادات اسی تعمیر کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اسی لیے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عبادات کے ظاہری پہلو کے ساتھ ساتھ ان کے باطنی مفہوم کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اگر عبادات کو صرف رسم کے طور پر ادا کیا جائے اور ان کے مقاصد کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کا عملی اثر محدود ہو جاتا ہے۔

فکرِ قرآن کی روشنی میں حج کا مقصد محض چند ظاہری اعمال کی ادائیگی نہیں بلکہ انسان کے اندر ایک ایسی فکری اور اخلاقی تبدیلی پیدا کرنا ہے جو اس کی زندگی کے رخ کو بدل دے۔ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ نے اپنی تصانیف مثلاً قرآنی فیصلے اور سلیم کے نام خطوط میں بارہا اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دعا کا اصل مفہوم محض الفاظ دہرانا نہیں بلکہ اپنی خواہشات اور مقاصد کو خدائی اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے
تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

حج اور مرکزِ ملت کا شعور

فکرِ پرویز کا ایک اہم پہلو ''مرکزِ ملت'' کا تصور ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں ایک مرکزی نقطہ موجود ہوتا ہے جو پوری امت کو ایک لڑی میں پروئے رکھتا ہے۔ کعبہ اسی مرکز کی علامت ہے، اور حج اس مرکز سے عملی وابستگی کا اظہار۔

حج کا اجتماع اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ مختلف زبانوں، قومیتوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی

مقصد کے تحت جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ منظر اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ انسانیت کے درمیان موجود ظاہری اختلافات کے باوجود ایک مشترکہ بنیاد پر اتحاد ممکن ہے۔

پرویز صاحب کے نزدیک یہی وہ شعور ہے جو امت کو ایک زندہ اور متحرک قوت بنا سکتا ہے۔ اگر مسلمان اس مرکزیت کو صرف ایک رسمی وابستگی کے بجائے ایک عملی تعلق میں تبدیل کر سکیں تو ان کی اجتماعی قوت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

فکری بیداری کی ضرورت

غلام احمد پرویز کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں فکری بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک دین کو سمجھنے کے لیے محض روایت پر انحصار کافی نہیں بلکہ قرآنِ کریم پر غور و فکر بھی ضروری ہے۔

انہوں نے بارہا اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ مسلمانوں کی زوال پذیری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے دین کے اجتماعی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک حج کا اجتماع اس کمی کو پورا کرنے کا ایک بہترین موقع فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ اس کے مقاصد کو سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ خیال ان کے مختلف مضامین اور خطوط میں بکھرا ہوا ملتا ہے، جہاں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دین کا اصل مقصد انسان کو ایک ایسے نظام سے جوڑنا ہے جس میں عدل، مساوات اور باہمی تعاون کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔

حاصلِ گفتگو

غلام احمد پرویز کی تعبیرات سے اختلاف کی گنجائش ہمیشہ موجود رہی ہے، اور علمی حلقوں میں ان کے خیالات پر بحث بھی ہوتی رہی ہے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انہوں نے دین کے اجتماعی پہلو کو نمایاں کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی۔

حج کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر ہمیں اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ اس عظیم اجتماع کی اہمیت صرف انفرادی عبادت تک محدود نہیں بلکہ اس کے اندر ایک وسیع تر اجتماعی پیغام بھی پوشیدہ ہے۔ اگر اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو حج نہ صرف فرد کی اصلاح بلکہ امت کی فکری اور عملی بیداری کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

آج کے دور میں، جب عالمِ اسلام مختلف مسائل اور چیلنجز سے دوچار ہے، یہ ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنی عبادات کے مقاصد پر غور کریں اور ان کے عملی اثرات کو اپنی اجتماعی زندگی میں نمایاں کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وہ سمت ہے جس کی طرف فکرِ پرویز ہمیں متوجہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل،
وائس چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام

شخصیات اور نظریات

بہت سی غلطیاں جن پر انسان عمل پیرا ہو رہے ہوتے ہیں ان کا تدارک محض اس لئے نہیں ہوتا کہ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے تو ان کا عمومی جواب یہ ہوتا ہے کہ سب کر رہے ہیں یا یہ کہ فلاں صاحب نے فرمایا ہے۔ گویا یہ سچائی تلاش کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب کوئی غلط عمل اگلی نسل میں منتقل ہو جائے تو وہ مستند بن جاتا ہے۔ اس پر سوال اٹھانا ہرگز مستحسن نہیں ہوتا بلکہ اسے بہت بڑی غلطی گردانا جاتا ہے۔

آج جبکہ آخری کتاب کو نازل ہوئے چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، بہت کم لوگ اس سے راہنمائی لیتے ہیں۔ ہونا تو چاہئے تھا کہ اپنی نظریات کو اس کی روشنی میں پرکھ لیں لیکن ایسا کرنے سے وہ سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جو صدیوں سے ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی رکاوٹ ہے جو ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ یہ صرف مذہبی سوچ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ فرسودہ رسم و رواج تک پھیلا ہوا ہے جو شادی بیاہ اور لین دین اور دوسری معاشرتی رسوم سے متعلق ہیں۔ اس کی بھی یہی ایک دلیل ہوتی ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔ غریب اگر چاہیں تو اپنی محنت کی کمائی کا بہت بڑا حصہ بچا سکتے ہیں لیکن نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب ضروری ہے کیونکہ لوگ کیا کہیں گے۔

اس روش کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے مثال کے طور پر۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٠٤﴾ (5:104)

مفہوم۔ تو ہم پرستانہ رسوم کو دین سمجھنے والوں کی حالت یہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور اس کے رسول کی طرف (جو اس کے مطابق ایک عملی نظام متشکل کر رہا ہے) تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے، وہی ہمارے لیے کافی ہے (2:170) (کس قدر احمقانہ ہے یہ جواب کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے پرکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم اسی پر آنکھیں بند کئے چلے جائیں گے، خواہ) ان کے یہ اسلاف نہ علم و بصیرت رکھتے ہوں، اور نہ ہی اللہ کی بتائی ہوئی راہ پر ہوں۔

ایک آیت جو دو مرتبہ آئی ہے اس میں اسلاف پرستی کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی ہے۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا

كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾ (2:141)

ترجمہ وہ ایک امت تھی جو گزر گئی ہے۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کیا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے کہ انہوں نے (تمہارے اسلاف) کیا کیا تھا۔

جب مروجہ اسلام کی طرف آئیں تو اس میں اسلاف پرستی کے علاوہ شخصیت پرستی بھی رائج ہے۔ متعدد مشہور مذہبی فرقوں میں اہمیت نظریات کی بجائے کسی شخصیت کی ہے۔ بعض تو شخصیات کے نام پر ہیں۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا آپ ان سب سے واقف ہیں۔ سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ فلاں حضرت نے یہ فرمایا یا یہ کہ فلاں حضرت یہ کیا کرتے تھے۔ بعض سے محیر العقول واقعات سرزد ہوتے تھے۔ یہاں کوئی اصول یا نظریہ نہیں بلکہ شخصیت مقدم ہو جاتی ہے اسی کا پرچار کیا جاتا ہے۔ ان کے کارنامے بیان ہوتے ہیں۔ حالانکہ مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا ہے کہ تم سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

یہ تو اسلاف کی بات تھی۔ شخصیت پرستی کا رجحان آج کل بڑھتا جا رہا ہے کیونکہ سوشل میڈیا پر نت نئے مذہبی سکالر آ رہے ہیں۔ ان کی نیت کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن جو بات سامنے آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ ان کی کچھ باتوں کو لے کر ان کی شخصیت سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں؟، جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی کوئی دلیل قرآن کریم دے رہے ہیں یا اسلاف کا ذکر کرتے ہوئے واقعات بیان کر رہے ہیں؟۔ کیا حقیقت جاننے کا یہی معیار ہو سکتا ہے؟ کیا انسان انسانی مسائل کا علاج دے سکتا ہے؟ جب اسلام کی بات کی جاتی ہے، اس کی بنیاد اور ماخذ کیا ہے۔ ان سب غور طلب امور ہیں۔

اس صورت حال میں بہت سے ذہنوں میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام کی متعدد اقسام کیوں ہیں؟ اس کا جواب تلاش کریں تو یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ اسلام کو سب مذہب سمجھ رہے ہیں اور اسے تمام مذاہب میں سب سے بہتر قرآن دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی جو مسالک رائج ہیں ان کا انتساب کسی نہ کسی شخصیت سے جا کر ملتا ہے۔ میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا البتہ یہ جاننا بہت مشکل نہیں ہے کہ اس وقت جو بھی اسلام کے نام پر فرقے / مسالک موجود ہیں ان کے بانی افراد ہیں اور ان کے ماننے والے انہیں کی کتب یا فرمودات کو ہی صحیح اسلام سمجھتے ہیں۔ ذہنی طور پر سب پاکستانیوں نے یہ قبول کر لیا ہے کہ کسی بھی مسلک سے وابستگی کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ کچھ سوچنے والے اگر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے تو سب سے زیادہ دیئے جانے والا جواب یہ ہوتا ہے کہ سب اپنے طور پر صحیح ہیں۔ یہ پگڈنڈیاں ہیں جو ایک ہی راستے سے جا کر مل جاتی ہیں۔ ان سب امور میں دو باتیں بہت کم لوگوں کے ذہنوں میں آتی ہیں ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم میں اس سے متعلق کیا آیا ہے؟ دوسری یہ کہ جس نظام کے ماتحت ہم زندگی گزار رہے ہیں کیا وہ قرآن کریم کے مطابق ہے؟

ابتدا میں ہم نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلاف پرستی سے سختی سے منع کیا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہ بات واضح کر دی کہ صحیح اور غلط کا معیار (الحق) اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اور شخصی اطاعت کے متعلق یہ اہم آیت آئی ہے کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)

مفہوم: دین کا اصول یہ ہے کہ محکومیت اللہ کے قانون کے سوا اور کسی کی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ اس باب میں، اس کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ اسے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم اللہ کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب، اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے، جس کی تم سب دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور وتدبر سے، اس کے مغز تک پہنچتے ہو، ربانی (یعنی اس کے نظام ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔

ایک اور آیت میں حاکم وقت کے لئے راہنمائی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے دی ہے۔ سورۃ الممتحنہ کی آیت 12 میں بیان کیا گیا ہے کہ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والی عورتوں سے کن امور میں بیعت لینی ہے۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی آیا ہے کہ ولا یعصینک فی معروف۔ یعنی وہ معروف میں آپ کی معصیت نہیں کریں گی۔ اور معروف تو قرآن کریم ہے روایات نہیں ہیں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی وہی بات حکم کے زمرے میں آئے گی جو معروف یعنی قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ جو بات وہ عام معاملات میں کرتے تھے اس میں ان کی پیروی کرنا مقصود نہیں تھا۔ اگر یہ ملکی قانون کا حصہ بنا دیا جائے کہ حکومتی اہلکار کسی بھی حکومتی عہدے دار چاہے وہ سربراہ مملکت ہی کیوں نہ ہو کسی ایسے قانون پر عمل درآمد کرنے کے پابند نہیں ہوں گے جو ملک کے آئین اور قانون کے خلاف ہو تو بے شمار بے قاعدگیوں اور غیر قانونی کاموں کی جڑ کٹ جائے گی۔ اسی بات کا اطلاق غیر حکومتی اداروں میں بھی وہی نتیجہ مرتب کرے گا۔ جہاں انسانوں کا بنایا ہوا نظام ہو وہاں ایسا قانون بنانا ممکن نظر نہیں آتا کیونکہ یہ تو قرآن کریم ہی سے ملے گا اور ایسے صاحب کردار افراد ایک حقیقی اسلامی مملکت ہی میں ملیں گے جن کا آئین اللہ کی کتاب ہوگا۔

شخصیت کے اتباع کا بہت بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات انسان اپنی کمزوریوں سے بے خبر ہوتا ہے اگر وہ اپنا جائزہ نہ لیتا رہے۔ قرآن کریم ایک آئینہ ہے جس میں انسان اپنی شخصیت کا حقیقی عکس دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ جس شخصیت کا اتباع کیا جا رہا ہو، اس کی کمزوریوں کی وجہ سے ہونے والے اثرات سے بچا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی ادارے کے عہدے دار یا سربراہ کی توجہ کسی بے قاعدگی کی طرف دلائی جائے تو وہ اسے اپنی ہتک سمجھتا ہے جس کی وجہ انا پرستی ہوتی ہے اس کے نتیجے میں آگاہ کرنے والے کی آواز صدا بصحرا اس لئے بن جاتی ہے۔ کہ بہت سے عقیدت مند اٹھ کر اسے ڈانٹ دیتے ہیں کہ صاحب کی بے عزتی کر رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرز عمل کا نتیجہ مستقبل میں اسی ملک یا ادارے کی تنزلی کی شکل میں آتا ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ کی جائے تو رفتہ رفتہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔

حکومتی سطح پر تو یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ اس میں مفادات پر زد پڑتی ہے۔ اگر غیر سرکاری ادارے اپنے ملازمین کی تربیت قرآن کے اصولوں پر کریں تو بہت سی خرابیوں کا سدِ باد ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم کے طالب علموں کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ حق وباطل کا معیار قرآن کریم کو بنائیں شخصیات کو نہیں۔ ابدی اللہ کی کتاب ہے، شخصیات دنیا سے چلی جاتی ہیں۔

مرتب: محمد سلیم اختر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کی اہمیت

طلوع اسلام کے خلاف مسلسل ہونے والے منفی پروپیگنڈا کے زیر اثر ہمارے نئے قارئین کی طرف سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ طلوع اسلام یا پرویز صاحب کا نماز سے متعلق نظریہ کیا تھا؟ سوان احباب کے استفادہ کے لئے نماز سے متعلق پرویز علیہ الرحمۃ کی وہ تحریریں جو طلوع اسلام کے مختلف پرانے شماروں اور کتابوں میں شامل ہیں‘ ان کو یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ اس کاوش کو مفید پائیں گے۔

”ایک صاحب نے مجھ سے حسب ذیل سوالات دریافت کئے ہیں۔

(1) آپ کہتے ہیں کہ اسلام قوانین خداوندی کا نام ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت اور مقام کیا ہے؟

(2) نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے۔ آپ نے کہیں اس کی صراحت کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد نماز ہے؟

(3) کیا آپ نماز کی موجودہ شکل کے علاوہ کوئی اور شکل تجویز کرتے ہیں؟

جواب

(1) اسلام نام ہے زندگی کے ہر شعبے میں احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا۔ ان کی پوری پوری اطاعت کرنے کا۔ نماز‘ اس طرح سر تسلیم خم کرنے کا عملی اعتراف اور محسوس مظاہرہ ہے۔ خدا کے سامنے سر جھکا دینے (سجدہ ریز ہو جانے) سے انسان اس امر کا اقرار (یا اظہار) کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر ارادے‘ فیصلے اور عمل میں اس کے احکام کی اطاعت کرے گا۔ جس کا دل‘ جذبات فرماں پذیری اور اطاعت گزاری سے لبریز ہو‘ اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جائے گا اور جو خدا کے حضور سر جھکانے میں عار یا سبکی محسوس کرتا ہے وہ اس کی اطاعت کیا کرے گا؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص زندگی کے مختلف شعبوں میں قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے‘ اس کا نماز میں رسمی طور پر سر جھکا دینا‘ مقصد صلوٰۃ کو پورا نہیں کرسکتا۔

(2) نماز فارسی (بلکہ پہلوی) زبان کا لفظ ہے جو اہل ایران کے قدیم طریق پرستش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ، اجتماعات صلوٰۃ کے لئے استعمال کرلیا گیا اور اب ہمارے ہاں یہی لفظ مروج ہے (میں سمجھتا ہوں کہ جو اصطلاحات قرآن کریم نے مقرر کی ہیں انہیں اسی طرح استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے) قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت ومحکومیت اختیار کرنا ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم نماز کا لفظ بولیں گے تو اس کا مطلب صرف نماز ہوگا۔ لیکن جب صلوٰۃ کا لفظ استعمال کریں گے تو اس میں نماز بھی آجائے گی اور اس کے علاوہ اور مفہوم بھی۔ میں نے اکثر مقامات پر اس کی صراحت کردی ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ مثلاً لغات القرآن میں لفظ صلوٰۃ (مادہ ص۔ل۔و(ی)) کے تحت آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے وہ فریضہ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات دی گئی ہیں جن میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے)۔

اس کے بعد ارکان صلوٰۃ کی اہمیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔

انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہوچکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خودبخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم وغصہ، خوشی، تعجب، عزم وارادہ، ہاں اور نہ، وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت واحترام اور اطاعت وانقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ''سر تسلیم خم'' ہوجاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام وسجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہوگا تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے

گا۔ احترام وعظمت، انقیاد و اطاعت اور فرماں پذیری و خودسپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم وضبط کا ملحوظ رکھنا بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔

مفہوم القرآن میں قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں لکھا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ''اقامت صلٰوۃ'' ہے جس کے عام معانی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کے ہیں۔ اس لئے صلٰوۃ میں، قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنابریں اقامت صلٰوۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں قوانین خداوندی کے اتباع کا تصور، محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ کس مقام پر اقامت صلٰوۃ سے مراد اجتماعات نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کردیئے گئے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ میں نے صلٰوۃ کے معنی نماز اور اقامت صلٰوۃ کے معنی اجتماعات صلٰوۃ کا قیام واضح الفاظ میں دیئے ہیں اور اس سے مراد وہی نماز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔

(3) ایک مقام پر نہیں، متعدد مقامات پر اور ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ان میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے میں فرقہ اہل قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنہوں نے اپنے لئے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہوجائے اور وہ تمام امت کے لئے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کردے تو یہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑا موثر اقدام ہوگا۔ یہ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد رسالت مآب اور خلافت راشدہ میں، امت ایک ہی طریق پر نماز ادا کرتی ہوگی۔ اس وقت امت میں وحدت تھی۔ اس لئے جب ہم پھر سے اسی عہد سعادت مہد کی طرف رخ کریں گے تو امت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضرور کرنی ہوگی اور نماز اس کا بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب امت میں وحدت پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں، تو میں اس سے بحث نہیں کرتا۔

(''طلوع اسلام'' نومبر و دسمبر 1961ء ص:12)

نماز کی اہمیت

میں نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں کہ بعض اراکین بزم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اب جو اسلام کو سمجھا ہے، اس کی بناء پر نماز

پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ''طلوع اسلام'' نے آپ کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز نہ پڑھنے پر فخر کرو؟ آپ نے غیر قرآنی روش زندگی کو تو نہ چھوڑا' اوراس کے بجائے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے اور ستم بالائے ستم کہ اپنے آپ کو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستہ ظاہر کر کے ایسی باتیں کرنے لگے۔طلوع اسلام پر آخر یہ کتنا بڑا الزام ہے جو آپ نے عائد کر دیا۔

ذاتی طور پر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں اور میں ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں۔لیکن یہ انتہائی ظلم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کے لئے جواز کی صورتیں تلاش کرنے لگ جائیں۔آپ قرآنی نظریات کے خلاف سب کچھ کر رہے ہیں۔ تجارت' کاروبار' شادی' رشتے ناطے سب کچھ ہو رہا ہے۔ بینک بیلنس برابر قائم ہیں۔قرآن کے مطابق انہیں بدلنے کے لئے آپ کے ذہن میں کبھی کچھ نہیں آیا۔ پھر نماز کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (بعض گوشوں سے آوازیں آئیں کہ یہ بھی ہمارے مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے جو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستگی ظاہر کر کے اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا) ہم معاشرے میں اصلاح کا آغاز اپنے گھروں سے ہی کر سکتے ہیں لیکن اگر پہلے خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں تو پھر اصلاح کس طرح ہوگی؟ خدارا اپنے قول وعمل کو بصیرت' علم اور خلوص پر مبنی رکھئے۔ ''مقدس بہانے'' تلاش نہ کیجئے بلکہ اعتراف کیجئے اپنی کمزوریوں کا۔ہم نے قرآنی معاشرہ قائم کرنا ہے جو صرف نیک اور پاکباز زندگی بسر کرنے سے قائم ہو سکے گا۔

(منزل بہ منزل از پرویز' ص36-35)

غلط فہمی کا ازالہ

ہماری ہر محفل میں الصلوٰۃ کا بحیثیت نظام جس طرح بار بار ذکر آتا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ ہم نماز کے وقت اجتماعات کی اہمیت کے قائل نہیں۔..........صلوٰۃ کا وقتی اجتماع بھی قرآن ہی کا ارشاد ہے اور یہ الصلوٰۃ کے عالم آرا نظام ہی کی سمٹی ہوئی تصویر ہے۔ جو شخص نماز کی اہمیت کو کم کرتا ہے وہ طلوع اسلام کے خلاف فتنہ وشرارت کا محرک ہے اور ایسی مذموم حرکت کسی طرف سے نہ تو دانستہ ہونی چاہئے اور نہ نادانستہ۔

(ماہنامہ طلوع اسلام' مئی 1959ء ص14)

انجینئر سلیم اقبال، منگورہ سوات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اچھی زندگی کیا ہے؟ قرآن کا جواب

(انسان اور معاشرے کے لیے ایک متوازن زندگی کا قرآنی تصور)

انسانی تاریخ کے بنیادی سوالات میں سے ایک سوال ہمیشہ یہ رہا ہے: اچھی زندگی کیا ہے؟

کیا اچھی زندگی طاقت اور غلبہ حاصل کرنے کا نام ہے؟ یا شہرت، دولت اور سماجی برتری کا؟ یا پھر یہ کہ انسان دوسروں کے رویّوں کا مسلسل جائزہ لیتا رہے اور معاشرے کو ہر وقت کسی اخلاقی خطرے سے خبردار کرتا رہے؟

یہ سوال صرف فلسفے یا مذہب کا نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تجربے کا سوال بھی ہے۔ کیونکہ اگر زندگی کا مقصد واضح نہ ہو تو انسان یا تو طاقت کی دوڑ میں تھک جاتا ہے، یا اخلاقی برتری کے احساس میں دوسروں سے دور ہو جاتا ہے، یا پھر بے مقصدیت کے احساس میں الجھ جاتا ہے۔

قرآن اس سوال کا ایک مختلف اور متوازن جواب پیش کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک زندگی کا مقصد طاقت، شہرت یا اخلاقی بالادستی حاصل کرنا نہیں بلکہ ایک متوازن، باوقار اور پُرسکون انسانی زندگی ہے۔ ایسی زندگی جس میں انسان اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے، دوسروں کے حقوق کا احترام کرے اور ایک ایسے معاشرے کی تعمیر میں حصہ لے جس کی بنیاد عدل، رحمت اور انسانی وقار پر قائم ہو۔

قرآن اسی زندگی کو ایک جگہ ''حیاتِ طیبہ'' سے تعبیر کرتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ (سورۃ النحل: 97)

ترجمہ: ''جو شخص نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان رکھتا ہو تو ہم اسے ضرور ایک پاکیزہ اور اچھی زندگی عطا کریں گے۔''

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قرآن کے نزدیک اچھی زندگی صرف آخرت کا وعدہ نہیں بلکہ اسی دنیا

میں ایک بہتر انسانی حالت ہے۔

سادہ اور متوازن زندگی

قرآن انسان کو ایک سادہ اور متوازن زندگی کی طرف بلاتا ہے۔ ایسی زندگی جس میں انسان اپنی توانائی بنیادی انسانی سرگرمیوں میں صرف کرے: محنت کرنا، اپنی ضروریات پوری کرنا اور پھر آرام حاصل کرنا تاکہ جسم اور ذہن متوازن رہیں۔

قرآن دن اور رات کے نظام کو اسی توازن کی نشانی کے طور پر بیان کرتا ہے:

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿١١﴾ (سورۃ النبا:10-11)

یعنی اور ہم نے رات کو پردہ بنایا اور دن کو معاش (روزگار) کا وقت بنایا۔

یہ آیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ انسانی زندگی کا فطری نظام محنت اور آرام کے توازن پر قائم ہے۔

سکون ۔ اچھی زندگی کی بنیاد

اچھی زندگی کی ایک بنیادی علامت دل کا سکون ہے۔ جب معاشرہ خوف، حسد اور ناانصافی سے بھر جائے تو انسان کا اندرونی توازن بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾ (سورۃ الرعد:28)

ترجمہ: ''جو ایمان لاتے ہیں اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ خبردار! دلوں کا سکون اللہ کی یاد ہی سے ہے۔''

یہ سکون صرف انفرادی عبادت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس معاشرتی ماحول سے بھی پیدا ہوتا ہے جس میں اعتماد، انصاف اور احترام موجود ہو۔

عدل معاشرتی توازن کا ستون:

اگر معاشرے میں انصاف نہ ہو تو سکون بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے قرآن بار بار عدل پر زور دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (سورۃ النحل:90)

ترجمہ: ''بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔''

عدل معاشرے کو استحکام دیتا ہے اور احسان اس میں انسانیت پیدا کرتا ہے۔

معاشی انصاف

قرآن اچھی زندگی کو صرف اخلاقی یا روحانی حالت تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے معاشی انصاف سے بھی جوڑتا ہے۔ اگر

دولت صرف چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے تو معاشرے میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ (سورۃ الحشر 7)

ترجمہ: ''تاکہ دولت تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے۔''

یہ اصول بتاتا ہے کہ ایک متوازن معاشرے کے لیے معاشی انصاف بھی ضروری ہے۔

انسانی تکریم

قرآن انسان کو بنیادی طور پر قابلِ احترام مخلوق قرار دیتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (سورۃ بنی اسرائیل:70)

ترجمہ: ''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔''

اس اصول کے تحت کسی انسان کی قدر و قیمت اس کے رنگ، نسل، زبان یا طبقے سے نہیں بلکہ اس کی انسانیت سے متعین ہوتی ہے۔

جبر سے آزادی کی طرف

اخلاقی زندگی جبر سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ شعور اور آزادی سے پیدا ہوتی ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ (سورۃ البقرہ:256)

ترجمہ: ''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔''

یہ آیت انسانی ضمیر اور شعور کے احترام کی بنیاد رکھتی ہے۔

اخلاقی برتری کے فریب سے بچنا

قرآن انسان کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ وہ خود کو دوسروں سے اخلاقی طور پر برتر سمجھنے کے فریب میں مبتلا نہ ہو۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲ (سورۃ النجم:32)

ترجمہ: ''اپنے آپ کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ، وہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ متقی ہے۔''

یہ اصول انسان کو اس ذہنی رویّے سے بچاتا ہے جس میں کچھ لوگ خود کو معاشرے کا مستقل اخلاقی مصلح سمجھنے لگتے ہیں اور دوسروں کے معمولی رویّوں کو بھی بڑا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔

نفرت سے رحمت کی طرف

قرآن کا مقصد ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا ہے جس کی بنیاد نفرت نہیں بلکہ رحمت اور ہمدردی ہو۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۝۱۰۷ (سورۃ الانبیاء:107)

ترجمہ: ’’اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔‘‘

یہ رحمت انسانوں کے درمیان نرم دلی، برداشت اور احترام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

بامعنی زندگی

قرآن انسان کو یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ زندگی بے مقصد نہیں۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا (سورۃ المؤمنون 115)

ترجمہ: ’’کیا تم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے؟‘‘

یعنی انسان کی زندگی صرف بقا یا طاقت کی جدوجہد نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔

اختتام

قرآن کے نزدیک اچھی زندگی وہ ہے جس میں انسان اپنی ذمہ داریوں کو توازن کے ساتھ ادا کرے، دوسروں کے حقوق کا احترام کرے اور معاشرے میں عدل، رحمت اور سکون کو فروغ دے۔

یہ زندگی انسان کو:

- خوف سے سکون کی طرف
- ظلم سے عدل کی طرف
- نفرت سے رحمت کی طرف
- اور انتشار سے توازن کی طرف لے جاتی ہے۔

جب انسان اس راستے کو اختیار کرتا ہے تو وہ نہ طاقت کے فریب میں اپنی انسانیت کھوتا ہے اور نہ اخلاقی برتری کے احساس میں دوسروں سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ ایک سادہ، متوازن اور بامعنی زندگی جیتا ہے ایسی زندگی جس میں انسان خود بھی سکون پاتا ہے اور معاشرہ بھی امن اور اعتدال کی طرف بڑھتا ہے۔

قرآن انسان کو اسی متوازن اور باوقار انسانی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔

❁❁❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

تم بہت بہادر ہو

ارشد صاحب ایک سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک استاد تھے۔ بہت سے پڑھانے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بس کلاس میں سبق دے دیا اور پھر لڑکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ارشد صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ ظفر کو تقریر کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے اس کی ہمت بڑھائی اور اسے بتایا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ مزمل کو تصویریں بنانے سے دلچسپی تھی، ارشد صاحب اس کے لیے تصویریں بنانے کی کئی کتابیں لائے۔ سلیم کو شعر یاد کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے ایک کاپی پر اسے بہت اچھے اچھے شعر لکھ کر دیے۔ ایسے شعر جن سے آدمی کو اچھے اچھے سبق حاصل ہوں۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر سکول میں اچھے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لڑکے بھی۔ بہت سے استاد بُرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بُرائی کرتے تھے۔ مگر ارشد صاحب ایسے لڑکوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے ساتھیوں سے وہ اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ بُروں کو اچھا بنایا جائے۔ یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے اور مدتوں بعد اس محنت کا پھل ملتا ہے۔

چھٹی جماعت میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ وہ ہمیشہ سب سے بدتمیزی کرتا۔ نرمی سے بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے سڑک پر اس کی لڑائی ہوگئی۔ فیروز کہنے لگا:

”تم احمق ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں۔“

اتفاق سے یہ باتیں ارشد صاحب نے بھی سن لیں۔ دوسرے دن جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھانے آئے تو سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لڑکوں سے کہا:

”کل تمہارے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جاہل اور احمق کہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بُرا بھلا کہا۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو اگر تم دوسروں کی بے عزتی کرتے ہو تو اپنی ہی بے عزتی کرتے ہو۔“

”تعلیم اور شرافت کی ایک پہچان آدمی کی بات چیت ہوتی ہے۔ ادھر تم نے زبان کھولی اور ادھر پتہ چل گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن شریف میں ہمیں حکم دیا ہے کہ ہمیشہ ایسی زبان بولو جو شریفوں کی زبان مانی جاتی ہو۔“

''قرآن شریف نے ہمیں گفتگو اور بول چال کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ ہمیشہ صاف، سچی اور سیدھی بات کرو، جھوٹی باتوں سے ہمیشہ بچو۔ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرو۔ جب بھی بات کرو انصاف کی بات کرو۔''

اور ہاں! بعض بچے اونچی آواز میں چیخ چیخ کر، چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو آج پوری دنیا میں کہیں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ گنوار اور جاہل لوگ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ بہت پہلے قرآن شریف نے انسانوں کو بتایا تھا کہ اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔''

''اچھا میرے بیٹو! یہ تو ہو گئیں کچھ کام کی باتیں۔ اب اپنا سبق شروع کرو۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ فیروز اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا:

''جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر کہا: ''ضرور ضرور۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔''

فیروز نے کہا: ''جناب! آپ نے آج جو کچھ کہا ہے میرے دل میں ایک ایک بات اتر گئی ہے۔ آپ نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے میرا نام نہیں لیا۔ کل میں نے ہی ارشاد کو برا بھلا کہا تھا۔ میں اپنے بھائی ارشاد سے آپ سب کے سامنے معافی مانگتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میری کسی بات سے میرے کسی بھائی کو دکھ نہ پہنچے گا۔''

یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر فیروز کو گلے سے لگا لیا اور اس سے کہا: ''فیروز! تم بہت بہادر ہو۔۔۔ اپنی غلطی مان لینا سب سے بڑی بہادری ہے۔''

❁❁❁

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہو سکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوع اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؔ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورت نمبر	صفحات	ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	300/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	150/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	600/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	600/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	600/-
سورۃ آلِ عمران (اوّل)	(3)	472	600/-
سورۃ آلِ عمران (دوم)	(3)	480	600/-
سورۃ النساء	(4)	870	1000/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	600/-
سورۃ الانعام	(6)	600	700/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	550/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	550/-
سورۃ الانفال	(8)	210	300/-
سورۂ توبہ	(9)	530	600/-
سورۂ یونس	(10)	360	450/-
سورۂ ھود	(11)	400	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	400/-
سورۃ الرعد، ابراھیم، الحجر	(13-14-15)	500	600/-

سورۃ النحل	(16)	334	400/-
سورۂ بنی اسرائیل	(17)	396	500/-
سورۃ الکہف٬ مریم	(18-19)	532	600/-
سورۂ طٰہٰ	(20)	416	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	400/-
سورۃ الحج	(22)	380	500/-
سورۃ المومنون	(23)	408	500/-
سورۃ النور	(24)	264	400/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	500/-
سورۃ آلشعراء	(26)	454	500/-
سورۃ النمل	(27)	280	400/-
سورۃ القصص	(28)	334	450/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	500/-
سورۂ روم٬ لقمان٬ السجدہ	(30-31-32)	444	550/-
سورۃ الاحزاب٬ سباء٬ فاطر	(33-34-35)	570	700/-
سورۂ یٰسین	(36)	164	250/-
سورۃ الصافات٬ ص٬ زمر	(37-38-39)	450	550/-
سورۃ مومن٬ حٰم سجدہ٬ الشوریٰ	(40-41-42)	624	700/-
سورۃ الزخرف٬ دخان٬ جاثیہ٬ احقاف٬ محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	600/-
سورۃ الفتح٬ الحجرات٬ قٓ٬ الذاریات٬ الطور٬ النجم	(48-49-50-51-52-53)	550	650/-
سورۃ القمر٬ الرحمٰن٬ واقعہ٬ الحدید	(54-55-56-57)	384	500/-
اٹھائیسواں پارہ (مکمل)	(سورۃ المجادلہ تا سورۃ التحریم تک)	300	400/-
انتیسواں پارہ (مکمل)	(سورۃ الملک تا سورۃ المرسلات تک)	544	600/-
تیسواں پارہ (مکمل)	(سورۃ النبا تا سورت والناس تک)	624	700/-
شرح جاوید نامہ		800	1200/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

-4 وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

-5 وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

-6 کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

-7 وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

-8 مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

-9 ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں' انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

-1 کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

-2 جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

-3 جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

-4 جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان وکائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

-5 جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

-6 جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.79
ISSUE
06

Monthly TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org